اشکِ
ندامت
ملک صفدر حیات

اشکِ ندامت

ملک صفدر حیات

زن، زر اور زمین کے قصّے جتنے پرانے اتنے ہی نت نئے افسانے سامنے آکر دنیا کو حیران کرتے رہے ہیں... یہاں بھی دل کا معاملہ تھا پر نہ دل اپنی جگہ تھا اور نہ ہی نشانہ... ایسے میں خطا کا ہوجانا لازمی امر تھا... اور جب خطا ہوجائے تو سزا کسی بھی روپ میں ڈھل کر تعاقب سے باز نہیں آتی۔ وہ خطاوار کی جھولی میں ایسے آن گرتی ہے جیسے یہی اس کا اصل مسکن ہو... کچھ ایسا ہی مثلث یہاں بھی زیرِ عتاب تھا جس کے گرد خونِ ناحق نے ایک مضبوط دائرہ کھینچ لیا تھا... تاکہ مجرم قانون کی دسترس سے نکلنے نہ پائے، جہاں ملک صفدر جیسے باضمیر لوگ فعل کردار ادا کرتے ہوں وہاں معاشرے میں مجرم اور جرم زیادہ دیر کھل کھیل نہیں سکتے۔

دھوکے میں جان گنوانے والے معصوم انسان

کا عبرت اثر قصہ

جھنگ وسطی پنجاب کا ایک ایسا ضلع ہے جہاں ملک کے دو بڑے دریا جہلم اور چناب ہم آغوش ہوکر ایک طرف تو اس ضلع کی زمین کی زرخیزی بڑھاتے ہیں تو دوسری جانب عشق ومحبت کی داستانیں رقم کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ ”ہیر رانجھا“ اس سلسلے کی سب سے بڑی مثال ہے جو لوک ورثہ کی حیثیت کی حامل ہے۔

ان دنوں میں اسی ضلع جھنگ کے ایک دور دراز تھانے میں تعینات تھا اور اتفاق سے میرا تھانہ مذکورہ بالا دونوں دریاؤں کے درمیان واقع تھا اور وہ مقام بھی میرے تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں یہ دونوں دریا آپس میں مل جاتے تھے۔ ایک روز میں حسبِ معمول تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک سنسنی خیز خبر میری منتظر تھی۔

وہ مئی کا مہینا تھا۔ موسمِ گرما آغاز ہوچکا تھا۔ گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آکر اطلاع دی۔ ”ملک صاحب! ساتھ والے پنڈ میں ایک واردات ہوگئی ہے۔“

”کس قسم کی واردات؟“ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

”جناب! ایک گبرو جوان کو بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”تھوڑی دیر پہلے دو بندے آئے تھے تھانے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ قتل ہونے والے جوان کی لاش ادھر کھیتوں میں پڑی ہے۔“

”تم ساتھ والے کون سے پنڈ کی بات کررہے ہو سکندر علی؟ ہمارے تھانے سے قریب تر دو گاؤں ہیں۔ ایک گلاب پور اور دوسرا نذیر آباد......“

”جی...... میں گلاب پور کا ذکر کررہا ہوں۔“ کانسٹیبل سکندر نے جواب دیا۔

گلاب پور نامی وہ گاؤں میرے تھانے سے محض آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا جبکہ نذیر آباد اور میرے تھانے کے درمیان لگ بھگ پونے میل کا فاصلہ تھا اور یہ دونوں گاؤں آپس میں شمالاً جنوباً ایک میل کے فاصلے پر آباد

تھے، وہ اس طرح کہ گلاب پور شمال کی جانب اور نذیر آباد جنوب کی طرف۔ دونوں گاؤں کی زرعی اراضی بھی آپس میں ملی ہوئی تھی۔

میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ”قتل کی اس واردات کی اطلاع لے کر آنے والے کہاں ہیں؟ انہیں میرے پاس بھیجو۔“

”جناب! وہ اطلاع دینے کے بعد واپس چلے گئے ہیں۔“ کانسٹیبل نے بتایا۔ ”انہیں جلدی تھی۔ ویسے میں نے ان کی تاریخ اور جغرافیہ معلوم کرلیا ہے۔“

”مجھے بھی بتاؤ......“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”ان میں سے ایک کا نام ہے فیاض اور دوسرے کا یوسف۔“ کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ”اور ان دونوں بندوں کا تعلق بھی گلاب پور ہی سے ہے جناب۔“

”اور مقتول کے حدود اربعہ کے بارے میں کیا پتا چلا؟“

”وہ گبرو جوان بھی گلاب پور ہی کا رہنے والا ہے ملک صاحب۔“ سکندر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”اس کا نام ناصر ہے...... ناصر کبڈی کا بڑا ماہر کھلاڑی تھا۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے سکندر، جائے وقوعہ پر پہنچنے کی تیاری کرو۔“

”اچھا جی......!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میرے کمرے سے نکل گیا۔

جھنگ کے اس دور دراز تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ میں وہاں کے ماحول اور سرکردہ لوگوں سے تو اچھی طرح واقف ہو چکا تھا لیکن بہ قول کسے...... میں خود کو ابھی وہاں کی ”دائی“ کہنے کی پوزیشن میں نہیں آیا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کے اندر کانسٹیبل سکندر نے آکر مجھے بتایا۔ ”ملک صاحب! میں نے دو صحت مند گھوڑوں کا بندوبست کردیا ہے۔ آپ کا جب بھی حکم ہو، ہم روانہ ہو جائیں گے۔“

”بس، تو ہم ابھی اور اسی وقت روانہ ہو رہے ہیں۔“ میں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور کانسٹیبل سکندر علی دو گھوڑوں پر سوار ہو کر جائے وقوعہ کی سمت رواں دواں تھے۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، موضع گلاب پور میرے تھانے سے صرف نصف میل کی دوری پر واقع تھا لیکن یہ مختصر سا فاصلہ کسی سڑک پر سفر کرتے ہوئے طے نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ گلاب پور اور میرے تھانے کے بیچ کچی یا پکی سڑک نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ہمارے گھوڑے کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک آڑی ٹیڑھی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے موضع گلاب پور پہنچ گئے۔

گاؤں کے اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ناصر کی لاش کھیتوں میں پڑی ہے۔ چند لوگوں کی نگرانی بلکہ راہنمائی میں ہم جائے وقوعہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ مقام کھیتوں کے بیچ گاؤں سے نصف فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔

وہ ایک ادھورا کمرا تھا جس کی اب چھت دکھائی دے رہی تھی اور نہ ہی دیواریں سلامت تھیں۔ دروازے والی جگہ پر بھی چوکھٹ یا کواڑ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ہاں، بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا تھا کہ گزرے وقتوں میں کبھی وہاں کئی کمرے کی عمارت ہوا کرتی تھی۔

ناصر نامی جوان کی لاش اسی آدھے ادھورے کمرے کے سامنے پڑی تھی۔ جائے وقوعہ پر دو درجن سے زائد افراد کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ میں نے سب کو پیچھے ہٹایا اور اکڑوں بیٹھ کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

بلاشبہ وہ ایک بجیلا گبرو جوان تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ بائیس سے پچیس کے درمیان قائم کیا جو بعد ازاں تیس ثابت ہوا۔ وہ ایک مضبوط و نمایاں قد کاٹھ اور پہلوانی بدن کا مالک جوان تھا۔ رنگت گندمی اور سر کے بال گھنگرالے۔ قدرت نے اسے کسرتی بدن کی خوب صورتی کے علاوہ مردانہ وجاہت سے بھی دل کھول کر نوازا تھا لیکن اس وقت وہ زندگی سے خالی گوشت پوست کے ایک ڈھیر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ناصر کی...... حسرت ناک موت کا مجھے دلی صدمہ ہوا تھا۔

میں نے باریک بینی سے جب ناصر کی خون خون لاش کا جائزہ لیا تو مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اسے کسی تیز دھار چھرے یا خنجر کے متعدد وار کرکے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور بازوؤں پر موجود زخموں کے نشانات کو دیکھ کر واضح ہو جاتا تھا کہ اس نے خود کو بچانے کے لیے بہت کوشش کی تھی مگر حملہ آور نے اس کی ایک نہیں چلنے دی تھی اور بالآخر اسے بے بسی کی موت کو گلے لگانا پڑا تھا۔

گاؤں والے ناصر کو کبڈی کے حوالے سے گلاب پور کی آبرو سمجھتے تھے۔ ایسی بے بسی کی موت...... یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ حملہ آور ایک سے زیادہ افراد تھے ورنہ وہ گبرو کسی ایک قاتل کے بس کا تو نہیں تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت گھیر کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ گویا، یہ قتل کی ایک منظم واردات تھی۔

میں نے لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد اس پر ایک چادر ڈلوا دی اور موقع پر موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ سب سے پہلے جو شخص میرے سامنے آیا، اس کی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔ وہ ساٹھ کے آس پاس کا ایک سانولا آدمی تھا۔ اس کا نام بشیر لوہار معلوم ہوا۔ وہ منت ریز لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ”تھانے دار صاحب! کس ظالم نے میرے ناصر کی جان لی ہے؟“

اس کے درد بھرے سوال نے مجھے بتا دیا کہ وہ مقتول ناصر کا باپ تھا۔ میں نے بشیر لوہار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”چاچا...... ابھی تو میں نے تفتیش کا آغاز کیا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہارے بیٹے کا قاتل بہت جلد میری گرفت میں ہوگا۔“

وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ”میرا بیٹا تو گیا اس دنیا سے...... قاتل اگر آپ کی گرفت میں آ بھی گیا تو اس کی گرفتاری سے میرا بیٹا تو واپس نہیں آئے گا نا......“

غم کی شدت نے بشیر لوہار کے حواس مختل کردیے تھے۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ ان لمحات میں اسے صرف ایک ہی بات یاد تھی کہ اس کا جوان بیٹا قتل کردیا گیا تھا۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر بہت ترس آیا اور میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ”چاچا! آپ ایک طرف آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے بعد میں تسلی سے بات کرتا ہوں......“

”اچھا جی۔“ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

اس وقت تک سورج کافی اوپر اٹھ چکا تھا اور اچھا خاصا پریشانی کا باعث بھی بن رہا تھا۔ وہ مئی کا مہینا تھا۔ مئی اور جون تو ویسے بھی گرمی کے لحاظ سے اپنی قیامت خیزی میں سب مہینوں پر سبقت رکھتے ہیں۔ کھیتوں کے اندر تا حدِ نگاہ تیز چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے بشیر لوہار کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنایت بھرے انداز میں کہا۔ ”چاچا! آپ اپنے گھر چلے جاؤ تو بہت اچھا ہوگا۔ موسم بہت خوفناک ہو رہا ہے۔ میں یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا تمہارے گھر آؤں گا۔ پھر بات کریں گے۔“

”گرم ٹھنڈے سب موسم دیکھتے ہوئے ساری زندگی گزری ہے تھانے دار پتر!“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مجروح لہجے میں بولا۔ ”یہ دھوپ اور گرمی میرا کیا بگاڑے گی۔ میں ادھر درخت کے نیچے جا کر بیٹھ جاتا ہوں......“ لمحاتی توقف کے بعد وہ دکھی لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میری سب سے قیمتی متاع، میرے دل کا ٹکڑا زندگی کی بازی ہار گیا۔ اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہوگا میرے لیے!“

میں نے مقتول کے باپ بشیر لوہار سے زیادہ بحث نہیں کی اور اسے ایک بندے کے ساتھ، ایک سایہ دار درخت کی جانب بھیج دیا۔ میں فی الحال اس کے ساتھ اس سے زیادہ ہمدردی نہیں کرسکتا تھا۔

جائے وقوعہ کا میں نے نقشہ تیار کرلیا تھا۔ آلۂ قتل کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا جن کے لیے میرے تئیں ”آلاتِ قتل“ کے الفاظ زیادہ موزوں تھے کیونکہ مقتول کی لاش اور اس کے بدن پر دکھائی دینے والے متعدد خوفناک گھاؤ کو دیکھ کر اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی کہ ناصر پر حملہ آور ہونے والے افراد دو یا دو سے زیادہ تھے...... تو ظاہر ہے آلاتِ قتل بھی دو یا دو سے زیادہ ہی تھے۔

موقع پر موجود گواہوں کے بیانات کا سلسلہ تو بعد میں بھی جاری رکھا جاسکتا تھا۔ میری نظر میں سب سے اہم مسئلہ اس وقت مقتول ناصر کی لاش کو اسپتال بھجوانے کا تھا۔ موسم کے تیور بڑے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے فی الفور ناصر کی لاش کو پوسٹ مارٹم کی غرض سے سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔ کانسٹیبل سکندر کو بھی میں نے لاش کے ساتھ ہی روانہ کردیا تھا۔ جائے وقوعہ کی کارروائی میں اس نے میری بھرپور مدد کی تھی اور اب اس کی وہاں کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

میں نے اس ادھورے کمرے کے پاس کھڑے ہو کر چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ وہ مقام گاؤں گلاب پور سے محض آدھا فرلانگ کے فاصلے پر کھیتوں کے درمیان واقع تھا۔ لاش کی حالت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے رات کے وسطی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس بات کا پتا چلانا بہت ضروری تھا کہ آدھی رات کے وقت وہ اپنے گھر سے نصف فرلانگ دور کھیتوں کے اندر کیا کر رہا تھا؟

یہ سوال بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا...... میں نے وہاں موجود لوگوں سے گھما پھرا کر قتل کی اس لرزہ خیز واردات کے بارے میں مختلف سوالات کیے لیکن کوئی بھی مجھے ایسا جواب نہ دے سکا جو میرے لیے تسلی کا باعث ہوتا اور جو تفتیش کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوسکتا۔ میں نے ان دو افراد سے بھی پوچھ گچھ کی جو اس اندوہناک واقعے کی

اطلاع دینے تھانے پہنچے تھے۔ فیاض اور یوسف بھی اس قتل کے حوالے سے کچھ نہیں جانتے تھے۔ آخر میں، میں نے اس آدمی سے سوال وجواب کیے جس نے آج صبح ناصر کی لاش کو اس ادھورے کمرے کے باہر پڑے دیکھا تھا۔

اس بندے کا نام الیاس اور عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ پیشے کے اعتبار سے الیاس کمہار تھا۔ وہ مختلف قسم کے چھوٹے بڑے برتن تیار کیا کرتا تھا اور ظاہر ہے، ان برتنوں کی تیاری کے لیے چکنی مٹی کی ضرورت ہوتی تھی۔

''الیاس! تم صبح ہی صبح کہاں جارہے تھے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

''سرکار، ملا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''میں جدی پشتی کمہار ہوں جناب! میرے ہاتھ مٹی کے ساتھ کھیل کر اسے برتنوں کی شکل دیتے ہیں۔ بس سرکار......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ٹھنڈی سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں بھی روزانہ مٹی کی تلاش میں صبح ہی صبح گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ آج بھی میں اسی کام سے جارہا تھا۔ موتی بھی میرے ساتھ تھا۔ ناصر کی لاش کو دیکھ کر ہم دونوں کو جھٹکا لگا تھا۔''

''موتی کون؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھ لیا۔

''موتی میرے پالتو کتے کا نام ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اسے آپ گاؤں کی گلیوں میں آوارہ پھرنے والا کوئی کتا نہ سمجھیں۔ موتی بہت ہی تمیز دار اور سمجھ دار کتا ہے۔''

مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ الیاس ایک باتونی شخص تھا اور اپنی بات کو خوامخواہ طویل کرنا بھی اس کی عادت میں شامل تھا۔

''تم اور تمہارا کتا موتی حسبِ معمول آج صبح کھیتوں کی طرف جارہے تھے۔'' میں نے اسے واپس موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ناصر کی لاش کو دیکھا تو پریشان ہوگئے۔ پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے لاش کو دیکھ کر اونچی آواز میں چیخنا چلّانا شروع کردیا تھا۔'' وہ جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت کھیتوں میں اِکّادُکّا لوگ اپنے کام کا آغاز کرچکے تھے۔ میری آواز پر وہ فوراً متوجہ ہوگئے اور میری جانب لپکے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں موجود ہر شخص کو پتا چل گیا کہ بشیر لوہار کے لڑکے ناصر کو کسی نے بڑی بے دردی سے قتل کردیا ہے۔''

وہ اپنی طویل بات ختم کرکے خاموش ہوا تو میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا تم روزانہ صبح اپنے موتی کے ساتھ اسی راستے سے گزرتے ہو...... میرا مطلب ہے، اس ادھورے کمرے کے پاس سے تمہارا گزر ہوتا ہے؟''

''نہیں جناب......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میرا راستہ تو ذرا ہٹ کر ہے۔ میں ادھر سے گزرتا ہوں۔'' بات کے اختتام پر اس نے ایک سو گز دور ایک جانب اشارہ بھی کردیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آج اس کمرے کے قریب سے گزرنے کا کوئی خاص سبب تھا؟''

''جی ہاں، خاص سبب تھا۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا سبب تھا؟''

''میں تو جناب ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنے راستے پر جارہا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اچانک موتی نے پہلے ہلکے ہلکے غرانا اور پھر بھونکنا شروع کردیا۔ موتی کی اس حرکت پر میں چونک اٹھا کیونکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ موتی جب بھی اس قسم کا ردعمل ظاہر کرتا ہے، کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور نازل ہوتی ہے اور آج بھی بالکل ویسا ہی ہوا......'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے موتی کی حرکت پر توجہ دی تو یہ اپنے راستے سے ہٹ کر اس کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا اور یہاں پہنچ گیا۔ اس کے بعد کی بات میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔''

الیاس کی وضاحت انتہائی قابلِ یقین اور سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ جانور خصوصاً کتا بہت سے ایسے معاملات کا ادراک کرلیتا ہے جو انسان کے بس کی بات نہیں۔ خاص طور پر اس کے سونگھنے کی حس ناقابلِ یقین حد تک تیز ہوتی ہے۔

''تم نے یہاں پہنچ کر ناصر کی لاش کو دیکھا اور چلّا کر لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا اس وقت تم نے آس پاس کسی مشکوک بندے کو بھی دیکھا تھا؟''

''کیسا مشکوک بندہ؟'' الٹا اس نے مجھ سے ہی سوال کرڈالا۔

''کوئی بھی ایسا بندہ یا بندے جن پر ناصر کے قاتل ہونے کا شک کیا جاسکے؟'' میں نے اپنی بات کی وضاحت

کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''ایسا کوئی بندہ مجھے تو یہاں نظر نہیں آیا۔''

میں نے مزید دو چار سوال کے بعد الیاس کمہار کو فارغ کردیا اور مقتول ناصر کے باپ بشیر لوہار کے ساتھ گاؤں کی جانب چل پڑا۔

☆☆☆

بشیر لوہار کا گھر گلاب پور کے وسط میں واقع تھا۔ وہ ایک مختصر سا خاندان تھا۔ میاں بیوی اور دو بچے جن میں سے ایک اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا تھا۔ ناصر سے چھوٹی اس کی بہن رخسانہ تھی جس کی عمر لگ بھگ سولہ سال رہی ہوگی۔ بشیر لوہار نے اپنے گھر کے بیرونی کمرے میں بھٹی لگا رکھی تھی جہاں وہ دن بھر لوہے سے ''کھیلتا'' رہتا تھا۔ بس یہی اس کی زندگی تھی اور وہ اپنی اس زندگی سے بہت مطمئن تھا تاہم ناصر کی المناک موت نے گویا اس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

بشیر مجھے اپنے گھر کے اندرونی حصے میں لے گیا اور برآمدے میں بٹھایا۔ وہ خود بھی میرے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

''بشیر چاچا! تمہارے بیٹے کے ساتھ جو بھی افسوسناک واقعہ پیش آیا، اس کا مجھے بہت دکھ ہے اور میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ میری اولین کوشش یہی ہوگی کہ میں اس واقعے کے ذمے دار کو جلد از جلد قانون کی گرفت میں لاکر سخت ترین سزا دلواؤں لیکن اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔''

بشیر کی بیوی زبیدہ بی بی بھی میرے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے جو بات بشیر سے کی تھی، وہ اس نے بھی سن لی تھی۔ بشیر کے جواب سے پہلے وہ بول اٹھی۔

''تھانے دار جی! بتائیں، ہم آپ کی کیا مدد کرسکتے ہیں'' اس نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ ''ہماری تو دنیا ہی اندھیر ہوکر رہ گئی ہے۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہ کتنا بڑا واقعہ ہے۔ اگر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا تو پھر کبھی بھی یہ گتھی حل نہیں ہوسکے گی۔''

بشیر کی بہ نسبت اس کی بیوی میں زیادہ دم خم نظر آتا تھا۔ میری بات کے جواب میں اس نے کہا۔ ''میں بھی یہی چاہتی ہوں، جس ظالم نے میرے ناصر سے حیاتی چھینی ہے وہ جلد از جلد عبرت ناک انجام کو پہنچے۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بڑے عزم سے بولی۔ ''بتائیں، آپ کو ہم سے کس قسم کا تعاون چاہیے؟''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ ''مجھے بتائیں، ناصر کا قتل کون کرسکتا ہے؟''

''یہ بتانا تو بہت مشکل ہے جناب۔'' بشیر بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''رب ہی بہتر جانتا ہے۔''

''رب تو بہتر جانتا ہی ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن جب تک آپ کسی پر شک ظاہر نہیں کریں گے، تفتیش کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔''

بشیر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''ناصر تو پورے گاؤں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ابھی پچھلے مہینے ہی تو اس نے کبڈی کا ٹورنامنٹ جیتا تھا۔ اگر ناصر گلاب پور کی کبڈی ٹیم میں نہ ہوتا تو جیت کا اعزاز نذیر آباد کے حصے میں آنا تھا۔ اس ٹورنامنٹ میں چار گاؤں کی ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔ سلطان نگر اور چک بیالی (بیالیس) تو ابتدا ہی میں کٹ گئی تھیں۔ اصل کانٹے کا مقابلہ گلاب پور اور نذیر آباد کے درمیان تھا۔ فائنل میچ میں ناصر کی عمدہ کارکردگی نے گلاب پور کا سر فخر سے بلند کردیا تھا۔ یہ ٹورنامنٹ ہر سال اپریل کے مہینے میں منعقد کرایا جاتا ہے۔''

بشیر لوہار نے کبڈی ٹورنامنٹ کے حوالے سے بات ختم کی تو میں نے سوال کیا۔ ''چاچا! تمہارے بیٹے کی کبڈی کی میں نے بھی بڑی تعریف سنی ہے۔ میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ناصر اپنے گاؤں کی آبرو تھا لیکن......'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چاچا! تم نے بھی ایک زندگی گزاری ہے۔ یہ بات تو تمہارے تجربے میں بھی آئی ہوگی کہ جہاں کسی انسان کے دس دوست ہوتے ہیں، وہاں اس کا ایک آدھ دشمن بھی ضرور موجود ہوتا ہے؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی بات سے انکار نہیں کرسکتا۔''

''مجھے اسی دسویں آدمی کی تلاش ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جس ظالمانہ انداز میں ناصر کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے وہ کسی...... بدترین دشمن ہی کا کام ہوسکتا ہے اور...... ایسے سفاک شخص تک مجھے صرف آپ لوگ ہی پہنچا سکتے ہو۔''

بشیر لوہار نے اضطراری انداز میں اپنی پیشانی کو مسلا پھر الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''سمجھ میں بالکل نہیں آرہا کہ ایسا بندہ کون ہوسکتا ہے۔''

میں نے بشیر کی بیوی زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم یاد کرنے کی کوشش کرو...... گلاب پور میں کون تمہارے بیٹے کو سخت ناپسند کرتا تھا...... کبھی کسی کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا ہو؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ناصر تو بہت ہی سلجھا ہوا اور امن پسند انسان تھا۔ گاؤں میں کبھی اس کا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔''

''اور گاؤں سے باہر......؟'' میں نے یکے بعد دیگرے دونوں کی طرف دیکھا۔

''باہر بھی کسی سے اس کی دشمنی نہیں تھی۔'' بشیر لوہار نے جواب دیا۔ ''وہ سارا دن میرے ساتھ کام میں مصروف رہتا تھا۔ صبح شام ورزش وغیرہ کے لیے اکھاڑے میں چلا جاتا تھا۔''

''یہ اکھاڑا کس طرف واقع ہے؟'' میں نے کسی فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''ٹیوب ویل کے قریب ہی جی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کھیتوں میں۔''

ٹیوب ویل کے نام پر میں چونکا۔ ''کیا تم اسی ٹیوب ویل کی بات کر رہے ہو جو پہلے اس جگہ ہوا کرتا تھا جہاں سے ناصر کی لاش ملی ہے؟''

''جی ہاں، یہ ٹیوب ویل کسی زمانے میں اسی کمرے میں لگا ہوا تھا۔'' اس نے تائیدی لہجے میں بتایا۔ ''لیکن یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔''

''بشیر چاچا! میری تجربہ کار نگاہ بتاتی ہے کہ تمہارے بیٹے کو پچھلی رات کے درمیانی حصے میں قتل کیا گیا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ ناصر صبح و شام اکھاڑے میں کسرت وغیرہ کے لیے جایا کرتا تھا پھر وہ آدھی رات کو گھر سے باہر کیا کر رہا تھا اور وہ بھی اکھاڑے سے سو، دو سو گز دور......؟''

''یہ بات تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آرہی تھانے دار صاحب۔'' زبیدہ بی بی نے تفکر آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ ''ناصر پچھلی رات ادھر کیا کرنے گیا تھا۔''

''کیا وہ رات کو معمول کے مطابق گھر میں سویا تھا؟''

''جی بالکل......!'' زبیدہ نے جواب دیا۔

بشیر لوہار بولا۔ ''کل شام سے پہلے وہ ورزش کرنے اکھاڑے میں بھی گیا تھا۔ پھر ہم چاروں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور تھوڑی دیر کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئے۔''

''آپ لوگ رات میں سوتے کہاں ہیں؟'' میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔ ''موسم ایسا ہے کہ کمروں کے اندر گھس کر سونا ممکن نہیں رہا......''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب! آج کل دن تو دن، رات میں بھی اچھی خاصی گرمی ہو رہی ہے۔'' بشیر نے جواب دیا۔ ''میں، زبیدہ اور ہماری بیٹی رخسانہ گھر کے صحن میں چارپائیاں بچھا کر سوتے ہیں۔''

''اور ناصر...... وہ رات کو کہاں سوتا تھا؟''

''وہ چھت پر سوتا تھا جی۔'' زبیدہ نے جواب دیا۔

بشیر نے کہا۔ ''صرف سردیوں کے دو تین مہینے وہ اپنی چارپائی نیچے لاتا تھا ورنہ اس کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی کہ وہ رات کو چھت پر ہی سویا کرتا تھا۔''

''میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں ناصر رات کو سوتا تھا۔''

''آپ آئیں میرے ساتھ۔'' تھوڑی دیر بعد ہم دونوں چھت پر تھے۔ جہاں پر ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ چارپائی پر ایک تکیہ اور چادر بھی موجود تھی اور ان دونوں چیزوں کی موجودگی بتاتی تھی کہ وہاں رات کوئی سویا تھا۔ میں نے چاروں جانب نگاہ دوڑا کر ماحول کا جائزہ لیا۔

شہروں کی طرح گاؤں میں کثیرالمنزلہ مکانات تعمیر نہیں کیے جاتے۔ چودھری یا گاؤں کے کسی بڑے کے گھر کے علاوہ تمام مکان کچے اور ایک منزلہ ہی ہوتے ہیں۔ میں پچپن ساٹھ سال پہلے کی بات کر رہا ہوں جب ننانوے فیصد مکانات مٹی سے بنائے جاتے تھے۔ آج کل تو گاؤں دیہات کی شکل ہی بدل کر رہ گئی ہے۔ پنجاب کے ستر فیصد گاؤں میں آج بجلی پانی کی سہولت موجود ہے۔ مکانات پختہ اینٹوں سے تعمیر کیے جاتے ہیں۔ سواری میں موٹر سائیکل عام دیکھنے میں آتی ہے اور موبائل فون کا استعمال بھی کافی بڑھ گیا ہے۔

گلاب پور ایک روایتی گاؤں تھا۔ بیشتر مکانوں کی چھتیں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ میں نے گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لیا اور ایک مرتبہ پھر ہم نیچے برآمدے میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''آپ لوگوں کو کب پتا چلا کہ ناصر گھر میں موجود نہیں؟''

''آج صبح ہی پتا چلا تھا جی۔'' بشیر لوہار نے بتایا۔ ''ناصر کو صبح اٹھنے میں کافی پریشانی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھ آسانی سے نہیں کھلتی۔ اس نے زبیدہ کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ وہ علی الصباح اسے جگا دیا کرے۔ زبیدہ فجر کی اذان کے

ساتھ ہی جاگ جاتی ہے۔ آج صبح جب یہ ناصر کو اٹھانے کے لیے چھت پر پہنچی تو وہ وہاں موجود نہیں تھا......''

''موجود نہیں تھا...... کیا مطلب؟'' میں نے اضطراری انداز میں پوچھا۔

اسی وقت زبیدہ لسی والا جگ اور گلاس لے کر ہمارے پاس پہنچ گئی۔ بشیر نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اسی سے پوچھ لیں کہ آج صبح چھت پر اس نے کیا نظارہ دیکھا تھا......''

''نظارہ......!'' میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھے۔

بشیر لوہار کی دونوں باتوں نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔ میرے اندر سے ایک آواز اٹھی کہ اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ آنے والا ہے۔ زبیدہ میرے لیے گلاس میں لسی انڈیل چکی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''زبیدہ بی بی! بشیر چاچا کیا کہہ رہا ہے۔ آج صبح جب تم ناصر کو اٹھانے چھت پر پہنچیں تو تم نے کون سا نظارہ دیکھا تھا؟''

وہ ایک طرف بیٹھ گئی پھر ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تو جی روزانہ ہی صبح اسے جگانے جایا کرتی تھی لیکن آج جو کچھ میں نے دیکھا، وہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا......''

''وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''جناب! میں روزانہ چھت پر جا کر اسے آواز دیا کرتی تھی...... ناصر پتر! اٹھ جا، صبح ہو گئی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''دوسری نہیں تو تیسری آواز پر وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا لیکن آج صبح جب ایسا نہیں ہوا تو مجھے حیرت ہوئی اور میں نے جھنجوڑ کر اسے جگانے کی کوشش کی اور اسی وقت پتا چلا کہ ناصر تو چارپائی پر موجود ہی نہیں......'' وہ لمحے بھر کے لیے رکی، ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''چارپائی پر چادر کے نیچے تکیہ اس طرح رکھا ہوا تھا کہ دور سے دیکھنے پر یہی نظر آئے کہ وہاں کوئی سو رہا ہے......''

''اوہ......!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، پچھلی رات ناصر اپنی مرضی سے گھر سے نکلا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی کو اس کی غیر حاضری کا احساس ہو؟''

''جی یہی بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' بشیر نے کمزور سی آواز میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ اس سے پہلے بھی یہ حرکت کرتا رہا ہوگا۔''

''جناب! اگر پہلے ناصر نے ایسا کیا ہوتا تو زبیدہ کی نظر میں آجاتا۔'' بشیر نے کہا۔

''نہیں......'' میں نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اس سے پہلے وہ اس لیے زبیدہ کی پکڑ میں نہیں آیا کہ صبح سے پہلے وہ واپس آجایا کرتا ہوگا۔''

ان لمحوں میں میرا ذہن نہایت ہی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ صرف ایک نکتے نے یہ کیس کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ مجھے اس معاملے میں سے عشق معشوقی کی بو آرہی تھی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار جی؟'' زبیدہ نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''ایسی کوئی بات ہمارے علم میں تو نہیں۔''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''آپ لوگوں کا بیٹا رات کی تاریکی میں کسی سے ملنے گھر سے باہر جایا کرتا تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ کوئی لڑکی ہو۔ بتائیں، ناصر کا گاؤں کی کسی لڑکی کے ساتھ چکر چل رہا تھا؟''

''چکر......!'' دونوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بشیر نے مجھ سے کہا۔ ''تھانے دار جی! ناصر اس قسم کا لڑکا نہیں تھا۔ وہ تو گلاب پور کی لڑکیوں اور عورتوں کو اپنی مائیں بہنیں سمجھتا تھا۔ وہ کبھی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔''

''میں مان ہی نہیں سکتا کہ اس کا کسی لڑکی سے کوئی محبت کا معاملہ نہ چل رہا ہو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ پچھلی رات اسی لڑکی سے ملاقات کرنے کھیتوں میں پہنچا تھا۔ اگر آپ لوگ مجھے اس لڑکی کے بارے میں صاف صاف بتا دو تو میں بڑی آسانی سے ناصر کے قاتلوں تک پہنچ جاؤں گا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر حتمی لہجے میں کہا۔ ''وہی لڑکی صحیح معنوں میں بتا سکتی ہے کہ پچھلی رات ادھر کھیتوں میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔''

''جناب! آپ ہم سے، بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ ہمیں ناصر کے کسی بھی ایسے معاملے کی خبر نہیں۔'' بشیر نے منت آمیز لہجے میں کہا۔ ''اور نہ ہی ہم ایسی کسی لڑکی کو جانتے ہیں۔''

''بشیر چاچا! عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اور قسمیں کھانے یا کھلانے سے پولیس والوں کا کام نہیں چلتا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں بہت جلد اس بات کا پتا چلا لوں گا کہ پچھلی رات تمہارا بیٹا کس سے ملنے کھیتوں میں پہنچا تھا لیکن اچھا یہی ہوتا کہ آپ لوگوں سے مجھے پتا چلتا۔''

زبیدہ نے بے بسی سے کہا۔ ''اگر ہمیں اس معاملے کی ذرا سی بھی سن گن ہوتی تو ہم آپ کو ضرور بتا دیتے۔''

''ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ کا اندازہ غلط ہے یا آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' بشیر نے عاجزی سے کہا۔ ''لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہمیں اس حوالے سے کچھ بھی پتا نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں آپ لوگوں کی بات کا یقین کر لیتا ہوں۔ اکثر ماں باپ کو اپنی اولاد کی سرگرمیوں کی خبر نہیں ہوتی اور وہ انہیں معصوم اور بے خطا ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ پھر جب ان کا کوئی کارنامہ سامنے آتا ہے تو دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتے ہیں۔ ناصر کے معاملے میں بھی بہت جلد ایسا ہی ہوگا......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے باری باری دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔

''یہ بتائیں، گلاب پور میں ناصر کی سب سے زیادہ گہری دوستی کس کے ساتھ تھی؟''

''جمیل کے ساتھ......!'' وہ بہ یک زبان ہو کر بولے۔

میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے، جو بات آپ کے علم میں نہیں وہ جمیل کو ضرور پتا ہوگی۔ کیا آپ میں سے کوئی جمیل کو یہاں بلا سکتا ہے؟ میں اس سے پوچھ کچھ کرنا چاہتا ہوں یا آپ مجھے اس کے گھر تک پہنچا دیں۔''

''وہ تو ہمارا پڑوسی ہے جناب۔'' بشیر نے بتایا۔ ''ادھر ساتھ والے گھر میں رہتا ہے لیکن ابھی اس سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔''

''کیوں نہیں ہو سکتی ملاقات؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ دو دن سے ٹوبہ ٹیک سنگھ گیا ہوا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے کل ہی جمیل کے بارے میں ناصر سے پوچھا تھا اور اس نے بتایا تھا جمیل پرسوں واپس آئے گا...... یعنی کل!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جمیل تو کل واپس آئے گا لیکن میں پھر بھی اس کے گھر والوں سے پوچھ کر اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں۔''

''جمیل کے باپ کی پرچون کی دکان ہے اور وہ اس وقت دکان پر ہی ہوگا۔'' بشیر نے کہا۔ ''آپ میرے ساتھ آئیں، میں آپ کو کفیل سے ملوا دیتا ہوں۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا۔ ''کیا کفیل کی دکان یہاں سے دور ہے؟''

''نہیں جی، اس نے گھر کے اندر ہی بیٹھک میں دکان کھولی ہوئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایک دروازے سے نکلیں گے تو ساتھ ہی آپ کو کفیل کی دکان نظر آجائے گی۔'' ہم دونوں اس کے گھر سے باہر نکل آئے۔ بشیر لوہار نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ جیسے ہی میں نے اس کے دروازے سے قدم باہر نکالا، کفیل کی پرچون والی دکان میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ آتے وقت میں نے اس دکان کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

کفیل کی عمر چالیس سے چڑھتی ہوئی تھی۔ وہ ایک دبلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے ہلکی ہلکی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور سر پر سفید ٹوپی بھی لگا رکھی تھی۔

میں نے لگ بھگ پندرہ منٹ تک اس کے ساتھ گفتگو کی۔ وہ مجھے دیکھ کر اپنے کام کو سمیٹ بیٹھا تھا اور پوری توجہ مجھ پر مبذول کر دی تھی۔ اسے ناصر کی موت کا دلی صدمہ تھا۔ اس لیے نہیں کہ مقتول ناصر اس کے بیٹے کا گہرا دوست تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ناصر اور اس کی کبڈی کو بے حد پسند کرتا تھا۔ وہ خود بھی جوانی میں یہ کھیل کھیل چکا تھا۔ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کا بیٹا جمیل بھی پہلوانی اور... شہ زوری کے کاموں میں حصہ لے لیکن جمیل نے اسے سخت مایوس کیا تھا۔ جمیل کو کبھی اس قسم کا کوئی شوق رہا ہی نہیں تھا۔

کفیل سے ہونے والی گفتگو اس لحاظ سے بے نتیجہ رہی کہ وہ ناصر کے قتل کے حوالے سے مجھے معلومات فراہم نہیں کر سکا تھا۔ وہ بھی مقتول کے کسی جانی دشمن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا البتہ اس امر کی اس نے تصدیق کی تھی کہ جمیل کل ٹوبہ ٹیک سنگھ سے واپس آجائے گا۔

''کفیل!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جمیل جیسے ہی گلاب پور پہنچے، تم اسے میرے پاس تھانے بھیج دینا۔ مجھے امید ہے، وہ اس قتل پر کچھ روشنی ڈال سکے گا۔''

''جی...... آپ فکر نہ کریں۔'' وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں خود اسے لے کر آپ کے پاس آؤں گا۔''

میں کفیل کی دکان سے باہر نکل آیا۔ میں نے واپسی کا

ارادہ ظاہر کیا تو بشیر لوہار نے مجھ سے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! ناصر کی لاش کب تک مجھے مل جائے گی؟''

میں اس دکھی باپ کی دلی کیفیات کو بہ خوبی محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ ''بشیر چاچا! مجھے امید ہے، کل شام تک ناصر کی لاش اسپتال سے واپس آجائے گی لیکن تم اپنے ذہن میں پرسوں کا دن رکھو تو تمہیں ''انتظامات'' کے سلسلے میں پریشانی نہیں ہوگی۔'' لمحاتی توقف کے بعد میں نے استفسار کیا۔

''تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی!'' اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے اسے ضروری ہدایات دیں، اس کے دکھ درد میں اپنی مکمل شرکت اور شمولیت کا یقین دلایا اور دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس آگیا۔

☆☆☆

میرا ذہن اور دل کسی بھی قیمت پر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ مقتول ناصر کا کسی لڑکی کے ساتھ کوئی چکر نہ ہو۔ اس نے اپنی چارپائی پر چادر اور تکیے کی مدد سے جو کہانی بننے کی کوشش کی تھی، وہ صد فیصد اسی جانب اشارہ کرتی تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کے علم میں لائے بغیر کہیں گیا تھا اور چاہتا تھا کہ گھر والوں کو اس کی اس حرکت کا پتا بھی نہ چلے اور اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ وہ ایسی حرکت پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوگا۔

میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میں نے بڑی توجہ اور تفصیل کے ساتھ جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا تھا۔ وہ ایک ایسا مقام تھا جو چوری چھپے کی ملاقاتوں کے لیے بڑا موزوں ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ ادھورا کمرا اگرچہ چھت اور دروازے سے بے نیاز تھا تاہم اس کی بچی کھچی دیواریں دو پریمیوں کی خفیہ ملاقات کے لیے بہترین آڑ فراہم کرتی تھیں۔ چونکہ وہ ایک متروک کمرا تھا لہٰذا اس حوالے سے اس طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں تو کہتا ہوں، اگر دن میں بھی کوئی جوڑا اس پناہ گاہ سے فیض یاب ہونے کا ارادہ کرتا تو اسے مایوسی نہ ہوتی کجا یہ کہ آدھی رات کی تاریکی میں......

گھوم پھر کر میری سوچ کی سوئی لڑکی کے کردار پر آکر اٹک جاتی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جو مقتول سے محبت کرتی تھی، ایک ایسی لڑکی جسے مقتول بے پناہ چاہتا تھا اور وہ دونوں راتوں کی تاریکی میں چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ میری سوچ

ہونہار شاگرد

استاد۔ ''برائی کیا ہے؟''

شاگرد۔ ''جناب میں بتاتا ہوں مگر پہلے میرے سوال کا جواب دیں کیا سردی کا کوئی وجود ہے؟''

استاد۔ ''ہاں۔''

شاگرد۔ ''جناب...... سردی کوئی چیز نہیں حرارت کی غیر موجودگی کو ہی سردی کہتے ہیں اور کیا اندھیرے کا کوئی وجود ہے؟''

استاد۔ ''ہاں۔''

شاگرد۔ ''پھر غلط جناب...... اندھیرا کوئی چیز نہیں روشنی کی غیر موجودگی کو ہی اندھیرا کہتے ہیں۔ ہم فزکس میں حرارت اور روشنی تو پڑھتے ہیں سردی اور اندھیرا نہیں، اسی طرح برائی کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ، ایمان اور پیار پہ بھروسا نہ ہونا ہی دراصل برائی ہے۔''

یہ ہونہار شاگرد تھا...... البیرونی۔

مرسلہ: محمد جاوید، تحصیل علی پور

مہکتی کلیاں

☆ جو شخص زیادہ سوچنے والا ہوتا ہے، وہ سب سے صحیح کام کرتا ہے۔

☆ دوسروں کے ساتھ زیادہ نیک سلوک وہی شخص کر سکتا ہے جو خود مصیبتوں میں مبتلا رہ چکا ہو۔

☆ ہر شخص ایک ضخیم کتاب ہے، بشرطیکہ آپ کو پڑھنا آتا ہو۔

☆ عقل مند دوسروں کی اور بے وقوف اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں۔

☆ پُرامید ہو کر سفر کرنا منزل پر پہنچنے سے بہتر ہے۔

مرسلہ۔ صدف ثاقب راجا، پنڈ دادن خان

کی اسی سنسنی خیزی کا دعویٰ تھا کہ وہ لڑکی بھی موضع گلاب پور ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے اس انداز میں سوچنے کا ایک خاص سبب تھا۔

جائے وقوعہ، وہ ادھورا کمرا گلاب پور گاؤں سے صرف نصف فرلانگ کے فاصلے پر کھیتوں کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ کوئی بھی لڑکی گلاب پور کے اندر سے سو، سوا سو گز کا فاصلہ طے کر کے اس ادھورے کمرے تک بہ آسانی پہنچ سکتی تھی۔ بہ صورتِ دیگر، جائے وقوعہ سے دوسرا نزدیکی گاؤں تھا نذیر آباد...... نذیر آباد اور جائے وقوعہ کے درمیان لگ بھگ ساڑھے سات فرلانگ یعنی ایک ہزار چھ سو پچاس گز کا زمینی فاصلہ حائل تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی لڑکی اتنا لمبا سفر کر کے مقتول سے ملنے اس مقام پر پہنچی ہوگی۔ تو یہ بات طے تھی کہ ناصر کی محبوبہ بھی گلاب پور ہی کی رہنے والی تھی۔

ان تمام تر حالات و واقعات کی روشنی میں ایک اور بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی اور وہ یہ کہ قاتل اس بات سے بہ خوبی آگاہ تھا کہ ناصر اس رات وہاں ضرور آئے گا۔ اگر وہ اتنا جانتا تھا تو پھر وہ اس حقیقت سے بھی یقیناً واقف ہوگا کہ مقتول رات کی تاریکی میں کس مقصد کے لیے اس الگ تھلگ مقام پر گیا تھا۔ اگر اس سچویشن پر غور کیا جاتا تو ایک سنسنی خیز بات ابھر کر سامنے آتی تھی۔

ناصر کا قاتل جو کوئی بھی تھا یا تھے...... وہ ناصر اور مبینہ لڑکی کے تعلقات سے واقف تھا اور یہ تعلقات اس کے لیے انتہائی ناقابلِ برداشت تھے۔ اگر اسی نتیجے پر اتفاق کر لیا جاتا تو پھر یہ تسلیم کرنا بھی لازم ٹھہرتا تھا کہ وہ شخص اس لڑکی کا کوئی امیدوار بھی ہو سکتا تھا......

اب پہلی فرصت میں مجھے اس لڑکی کو تلاش کرنا تھا جس کی محبت میں کبڈی کا ماہر ناصر گرفتار تھا اور اس تلاش کے لیے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے، جمیل کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

دوپہر کے بعد میں نے ایک کانسٹیبل کو حنیفاں کی جانب روانہ کر دیا۔ حنیفاں زبردست قسم کی پھاپھے کٹنی تھی۔ اس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے بارے میں صحیح طور پر کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ رہتی کہاں ہے۔ سب اسے ''کریم پاؤڈر والی حنیفاں'' کہتے تھے یا پھر ''چاچی حنیفاں''۔ وہ نگر نگر، گاؤں گاؤں گھوم پھر کر چوڑیاں، کریم، پاؤڈر اور عورتوں کے استعمال کی دیگر اشیا فروخت کیا کرتی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ لوگ تو اس کے بارے میں درست معلومات نہیں رکھتے تھے مگر وہ سب کی سن گن خوب رکھتی تھی۔ اور راز کی بات یہ تھی کہ وہ غیر محسوس انداز میں پولیس کے لیے مخبری بھی کیا کرتی تھی اسی لیے میں نے فی الفور اسے تھانے بلا لیا تھا۔ میں پہلے بھی ایک آدھ بار اس کی خدمات حاصل کر چکا تھا۔

لگ بھگ پانچ بجے سہ پہر حنیفاں میرے کمرے میں، میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''چاچی! کیا حال ہے تمہارا؟''

وہ جگت چاچی تھی۔ چھوٹا بڑا ہر کوئی اسے چاچی ہی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے سرکار۔ آپ سنائیں، کس خدمت کے لیے بلایا ہے؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھ لیا۔ ''گلاب پور کی طرف کب سے تمہارا چکر نہیں لگا؟''

''ایک ہفتہ پہلے ادھر گئی تھی ملک صاحب۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ''کیوں، کوئی خاص بات؟''

''پچھلی رات وہاں ایک نوجوان کا قتل ہو گیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کے قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

قتل والی بات سن کر اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ بھویں سکیڑتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''ادھر کون قتل ہو گیا ہے جی......؟''

''مقتول کا نام ہے ناصر۔'' میں نے بتایا۔ ''بشیر لوہار کا بیٹا ناصر۔ آج صبح ہی میں نے اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوائی ہے۔''

''آپ...... کہیں...... اس ناصر کی بات...... تو نہیں کر رہے جو کبڈی کا کھلاڑی بھی ہے......؟'' وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ہاں ہاں...... بالکل وہی۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''اسے کون نہیں جانتا ملک صاحب۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''وہ تو گلاب پور والوں کا ہیرو تھا جناب۔ گاؤں کا بچہ بچہ اس سے محبت کرتا تھا...... مجھے اس کی موت کا سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔ کس بدذات نے اس گبرو جوان کو قتل کیا ہے؟''

اس نے ایک ہی سانس میں متعدد سوالات کر ڈالے۔ میرے لیے یہ بات واقعی حیران کن تھی کہ ناصر کو بشیر لوہار کے بیٹے کی بہ نسبت کبڈی کے ایک کھلاڑی کی

حیثیت سے لوگ زیادہ جانتے تھے۔ کم از کم حنیفاں کے بے ساختہ تبصرے سے تو میں نے یہی محسوس کیا تھا۔

''حنیفاں!'' میں نے اسے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مخاطب کیا۔ ''اگر مجھے پتا ہوتا کہ ناصر کو کس نے قتل کیا ہے تو میں فوراً جا کر اس بندے کو ہتھکڑی لگا لیتا پھر تمہیں تھانے بلانے اور تم سے اس کیس میں مدد لینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''

''ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''حکم کریں ملک صاحب...... میں اس سلسلے میں کس طرح قانون کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہوں۔ مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہوگی۔ میری دلی خواہش ہے کہ ناصر کا قاتل جلد از جلد آہنی سلاخوں کے پیچھے نظر آئے۔''

''شاباش! تم نے میری خواہش کی بھی ترجمانی کی ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے، تم قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہو۔''

''آپ حکم کریں، مجھے کرنا کیا ہے؟'' وہ اٹین شین ہو گئی۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے بڑے جذباتی انداز میں بتایا ہے کہ گلاب پور کا بچہ بچہ ناصر سے محبت کرتا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کہا ہے یا نہیں؟''

''جی، یہ ایک حقیقت ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں سمجھ نہیں سکی، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ گلاب پور کا بچہ بچہ مقتول ناصر سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ جوان، گلاب پور کی کس حسینہ سے محبت کرتا تھا۔ گاؤں کی کس لڑکی کے ساتھ اس کا معاشقہ چل رہا تھا؟''

''اوہ......'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی۔ ''تو قتل کی اس واردات کا تعلق ناصر کی محبت کی کسی کہانی کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے؟''

''ایک سو ایک فیصد حنیفاں!'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ گمبھیر انداز میں مستفسر ہوئی۔ ''آپ کا مطلب ہے، اس لڑکی نے ناصر کا خون کیا ہے؟''

''نہیں، میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''لیکن مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ اگر وہ لڑکی میرے سامنے آ جائے تو میں بہ آسانی ناصر کے قاتل یا قاتلوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہوں اور......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے بڑی کھوجتی ہوئی نظر سے حنیفاں کی طرف دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہاری سنجیدگی اور دلچسپی کو دیکھ کر میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم ناصر کے کسی ایسے معاشقے کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہو۔''

''اچھی طرح تو نہیں مگر مجھے کچھ اڑتی اڑتی خبر ضرور ہے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''آپ مجھے ایک دن کی مہلت دیں تو میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے آپ کے سامنے رکھ دوں گی۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک دن کا وقت دیتا ہوں۔'' میں نے اس کی فرمائش پوری کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاس کل شام تک کی مہلت ہے لیکن تھانے سے نکلنے سے پہلے تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔''

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''کون سا کام؟''

''دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی تو کل شام تک الگ الگ ہو سکے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس وقت تو دونوں باہم ملے ہوئے ہیں یعنی مکس لسی ہیں...... ہیں نا؟''

''جی!'' اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''بس تو پھر یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے اس لسی کی ایک جھلک دکھا دو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے تھوڑی دیر پہلے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ تمہیں ناصر کے عشقیہ معاملات کی اڑتی اڑتی خبر ہے......؟''

''جی...... وہ اڑتی اڑتی خبر ہے۔'' وہ انکشاف کرتے ہوئے بولی۔ ''ریشماں!''

''ریشماں......!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یہ ریشماں کون ہے؟''

''ریشماں کا اصل نام ریشم ہے جی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ شکور ترکھان کی بیٹی ہے جو ادھر گلاب پور ہی میں رہتا ہے لیکن ملک صاحب!'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ ابھی کچی پکی اطلاع ہے...... آپ نے مجھے تصدیق کرنے کے لیے ایک دن دیا ہے۔ میں کل آپ سے کوئی ٹھوس بات کروں گی۔''

”ٹھیک ہے حنیفاں۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔”ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا۔ کسی کو احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تم کس مشن پر ہو۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

”چنگی طراں سمجھ رہی ہوں ملک صاحب۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔”آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔“

اور میں حنیفاں کی طرف سے بے فکر ہوگیا۔

اس سے میں پہلے ہی کئی مرتبہ مخبری کے کام لے چکا تھا اور اس نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز گرمی کا زور مزید بڑھ گیا تھا۔ گزشتہ روز کی بہ نسبت آج دھوپ میں کہیں زیادہ تپش پائی جاتی تھی۔ سورج نکلنے سے پہلے ہوا بند ہوگئی تھی۔ لگتا تھا، آج کا دن بہت قیامت خیز گزرے گا۔ اس سال گرمیاں کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کرگئی تھیں۔

میں نے دن کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ظہر کی نماز ادا کی ہی تھی کہ مجھے اطلاع دی گئی، گلاب پور سے دو افراد مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔ ان میں ایک کفیل کریانہ فروش اور دوسرا اس کا بیٹا جمیل تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد دراز قامت کفیل نے کہا۔

”تھانے دار صاحب! میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔ جمیل نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ میں اسے لے کر آپ کے پاس آگیا ہوں۔“

”شاباش!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”کفیل! اگر تمہاری طرح ہر شخص فرض شناسی اور ذمے داری کا مظاہرہ کرے تو ہمارا ملک جنت سے بھی زیادہ خوب صورت بن سکتا ہے۔“

”بس جی، میں تو اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ سادگی سے بولا۔”آگے اللہ کی مرضی!“

میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”کفیل! تمہیں تھوڑی دیر کے لیے باہر برآمدے میں بیٹھنا ہوگا۔ میں جمیل سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی ضرور......“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔”تھانے دار صاحب! آپ جمیل سے دل کھول کر باتیں کریں اور مجھے اجازت دیں۔“

”ٹھیک ہے، تم اگر چاہو تو واپس جاسکتے ہو۔“

وہ بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔”جمیل! یہاں سے فارغ ہونے کے بعد تم سیدھے گھر ہی آنا۔“

”ٹھیک ہے ابا جی۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”آپ بے فکر ہوکر جائیں۔“

کفیل تھانے سے رخصت ہوا تو میں جمیل کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ ایک گورا چٹا اور پستہ قامت جوان تھا۔ عمر پچیس کے اردگرد نظر آتی تھی۔ اس وقت وہ خاصا افسردہ دکھائی دیتا تھا۔ میں نے براہ راست گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔”جمیل! تمہیں ناصر کو پیش آنے والے واقعے کا تو پتا چل ہی گیا ہوگا؟“

”جی تھانے دار صاحب!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔”مجھے اس کی موت کا جتنا دکھ ہے، میں بیان نہیں کرسکتا۔“

”تم بیان نہ بھی کرو، میں پھر بھی تمہارے غم کو محسوس کرسکتا ہوں۔“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔”تمہارے خیال میں ناصر کی موت کا ذمے دار کون ہوسکتا ہے؟“

”جناب! فوری طور پر کچھ کہنا تو ممکن نہیں۔“ وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔”آپ کی تفتیش کیا کہتی ہے؟“

”میری تفتیش......“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔”میری تفتیش تو تمہاری جانب اشارہ کرتی ہے۔“

یہ بات کہتے ہوئے میرے ذہن میں جمیل کے لیے کوئی بھی منفی یا شک زدہ خیال نہیں تھا لیکن وہ بدک کر مجھے تکنے لگا اور اضطراری لہجے میں بولا۔”جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں بھلا اپنے دوست کی جان کیسے لے سکتا ہوں؟“

”مجھے یقین ہے کہ تم ناصر کی موت کے ذمے دار نہیں ہو۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔”کیونکہ تم تو پچھلے تین دن سے گلاب پور میں تھے ہی نہیں۔“

”پھر......“ اس کی الجھن میں حیرت کا بھی اضافہ ہوگیا۔”پھر آپ نے ایسا کیوں کہا کہ آپ کی تفتیش میری جانب اشارہ کرتی ہے؟“

”میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا جمیل۔“ میں نے وضاحت کی۔”میری تفتیش تمہاری جانب اس حوالے سے اشارہ کرتی ہے کہ تم مجھے ناصر کے قاتل تک پہنچا سکتے ہو۔“ لمحاتی توقف کرکے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”جمیل! کیا تم نہیں چاہتے کہ ناصر کا قاتل جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے باقی کی زندگی گزارے؟“

”میں اس سے بھی زیادہ چاہتا ہوں تھانے دار صاحب!“ وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔”مجھے تو وہ بندہ پھانسی کے پھندے پر لٹکا ہوا نظر آنا چاہیے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا، اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہے۔“

”وہ پھانسی کے پھندے تک ضرور جائے گا جمیل!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔”لیکن اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔ میں تمہاری مدد ہی سے قاتل تک رسائی حاصل کرسکتا ہوں۔“

”آپ حکم کریں جناب۔“ وہ بڑے جوش سے بولا۔ ”ناصر کے قاتل کو عبرت ناک سزا دلوانے کے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔“

”جمیل! میری تفتیش تو یہ کہتی ہے کہ ناصر کوئی پہلی مرتبہ چادر تکیے سے ڈراما رچا کر جائے وقوعہ تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار یہ کھیل، کھیل چکا تھا۔ تم اس کے گہرے اور رازدار دوست ہو۔ یہ بات تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ وہ رات کی تاریکی میں کس مقصد سے وہاں جایا کرتا تھا......؟“

اس کی آنکھوں اور چہرے پر تذبذب کے آثار پیدا ہوئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے کچھ بتانے کی کوشش کررہا ہو لیکن اندر سے کوئی قوت اسے ایسا کرنے سے روک رہی ہو۔ میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

”دیکھو جمیل! میں تو حقیقت تک پہنچ ہی گیا ہوں لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں، تم مجھ سے کس حد تک سچ بولتے ہو...... اس سے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ تم اپنے مقتول دوست سے کتنے مخلص ہو؟“

”جناب! آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟“ وہ بے چینی سے بولا۔

”وہ رات کی تاریکی میں کسی سے خفیہ ملاقات کرنے وہاں جایا کرتا تھا۔“ میں نے اپنی سوچ سے جمیل کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔”کسی لڑکی سے......؟“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“ اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔

”ریشماں سے نا......؟“ میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی!“ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”یہ سلسلہ کب سے چل رہا تھا؟“

”کوئی دو تین ماہ سے۔“ اس نے جواب دیا۔”وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ پہلے یہ پسندیدگی آنکھوں ہی آنکھوں تک محدود تھی۔ پھر بات چیت کا سلسلہ بھی چل نکلا اور پچھلے دو تین ماہ سے وہ رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر مل بھی رہے تھے۔“

”گویا ابھی ان کی ملاقاتوں کا معاملہ تازہ تازہ تھا۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”اس عشقیہ داستان سے اور کون کون واقف تھا؟“

”ناصر نے اپنی محبت کا راز صرف مجھے ہی بتایا تھا۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔”ریشماں اور ناصر کے درمیان میں ہی رابطے کا ذریعہ تھا۔“

”تم ان کا رابطہ کس طرح کرایا کرتے تھے؟“

”ریشماں ہماری دکان پر سودا لینے آیا کرتی ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔”اسے اچھی طرح پتا ہے، میں کب دکان پر بیٹھتا ہوں اور کب ابا۔ وہ اسی وقت سودا لینے آتی تھی جب میں دکان پر موجود ہوں۔ میں دونوں کے پیغامات ادھر سے ادھر کردیا کرتا تھا۔“

”اوہ......“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔”تو گویا تم ان دونوں کے بیچ ایک ڈاکیے کا کردار ادا کررہے تھے؟“

وہ ہلکی سی ندامت کے ساتھ بولا۔”جی ہاں۔“

”پھر تو تمہیں یہ بھی پتا ہوتا ہوگا کہ وہ کس رات کھیتوں میں ملاقات کریں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں...... مجھے پوری خبر ہوتی تھی۔“ وہ انکشافات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔”بلکہ میں ہی ریشماں کو بتایا کرتا تھا کہ کس رات اسے کھیتوں میں پہنچنا ہے۔ اگر وہ اپنی آمد کا یقین دلاتی تھی تو پھر میں ناصر کو بتا دیا کرتا تھا۔ ناصر ملاقات کے وقت سے تھوڑی دیر پہلے وہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔“

”کیا ان کی محبت بھری اس ملاقات کے موقع پر تم بھی آس پاس ہی موجود رہا کرتے تھے؟“ میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔”میں کبھی اس طرف نہیں گیا تھا، البتہ دوسرے دن ناصر خود ہی مجھے بتا دیا کرتا تھا کہ ان دونوں کے بیچ کس طرح کی محبت بھری باتیں ہوئی تھیں۔“

”اچھا، تو تمہیں پوری خبر تھی کہ ان کی محبت کتنی بلندی پر پرواز کررہی تھی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”جی تھانے دار صاحب!“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔”وہ دونوں بہت تیزی سے قریب آرہے

تھے۔ ریشماں کا اصرار تھا کہ ناصر فوراً اپنا رشتہ اس کے گھر بھیجنے کی کوشش کرے یعنی...... اپنے والدین کو رشتہ لینے اس کے گھر بھیجے۔"

جمیل خاصے دلچسپ اور اہم انکشاف کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی فراہم کردہ معلومات بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوں گی۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ناصر کو بھی شادی کی اتنی ہی جلدی تھی یا وہ محض تفریح کی غرض سے ٹائم پاس کر رہا تھا؟"

"وہ بھی ریشماں کو اپنانے کے لیے انتہائی سنجیدہ تھا مگر اس کی سنجیدگی میں ریشماں والی جلد بازی اور بے قراری نہیں تھی۔" اس نے بتایا۔ "میں سمجھتا ہوں، ریشماں کی بے چینی اور اضطراب کا ایک خاص سبب تھا جس کے پیشِ نظر وہ جلدی کا تقاضا کر رہی تھی۔"

"اور وہ سبب کیا تھا برخوردار؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تھانے دار صاحب!" وہ بتانے لگا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ ریشماں کی ماں سردار بی بی اس کا رشتہ اپنی بڑی بہن کے لڑکے سے کرنے کی خواہش مند تھی۔ آج کل ان کے گھر میں یہی باتیں ہو رہی تھیں لیکن ریشماں کا باپ شکور ترکھان اس رشتے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ وہ ریشماں کے ددھیال میں اس کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ ریشماں کو یہ بات بھی پتا ہے کہ بالآخر جیت اس کی ماں ہی کی ہوگی۔ گھر میں شکور ترکھان سے زیادہ اس کی بیوی کی چلتی ہے۔ اس صورتِ حال نے ریشماں کو بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ وہ نہ تو اپنی خالہ کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہے اور نہ ہی شکور کے خاندان میں...... اسی لیے وہ ناصر پر زور ڈال رہی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے ماں باپ کو اس کے گھر بھیج دے۔"

"ٹھیک ہے، ریشماں کی پریشانی تو سمجھ میں آ رہی ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "لیکن ابھی چند باتیں جواب طلب ہیں......"

وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

"جمیل!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بتایا ہے کہ ریشماں اور ناصر کی محبت والا معاملہ تمہارے سوا اور کسی کے علم میں نہیں تھا۔ تم ہی ان دونوں کے مشترکہ رازدار تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں جناب...... حقیقت یہی تھی۔" وہ بڑے وثوق سے بولا۔

"اور تم ہی ان دونوں کے بیچ ملاقات کی سیٹنگ بھی کیا کرتے تھے؟" میں نے کہا۔ "یہ بات تمہارے ہی توسط سے ریشماں تک پہنچا کرتی تھی کہ کس رات کھیتوں میں ناصر اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ ہیں نا؟"

"جی ہاں!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "تم پچھلے دو دن سے گلاب پور میں نہیں ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے واپس آئے ہو لیکن ناصر کا قتل پچھلی رات کو ہوا ہے۔ وہ کھیتوں میں پہنچا تھا تو اس کی لاش ادھر سے ملی ہے اور...... آدھی رات کے وقت وہ ظاہر ہے، ریشماں سے ملنے ہی ادھر گیا ہوگا......" میں نے لمحے بھر کو رک کر گہری نظر سے اسے دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب تم گلاب پور میں موجود ہی نہیں تھے تو پھر ریشماں کو اس ملاقات کی خبر کس نے دی ہوگی؟ کیا اس بار ناصر نے خود ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ اسے کس رات ملاقات کے لیے کھیتوں میں پہنچنا ہے؟"

"نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جس دن میں ٹوبہ ٹیک سنگھ گیا ہوں، اسی روز یہ بات طے ہوگئی تھی کہ پچھلی رات ان دونوں کو کھیتوں میں ملاقات کرنا ہے اور میں نے اس پروگرام سے ریشماں کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اس کی طرف سے یقین دہانی کے بعد ہی میں نے ناصر کو خوش خبری سنائی تھی کہ وہ ضرور آئے گی۔"

"اس کا مطلب ہے، ناصر گزشتہ رات پروگرام کے عین مطابق، ریشماں سے ملاقات کرنے ادھر کھیتوں میں پہنچا تھا؟" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی بالکل!" اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

"اور یقیناً ریشماں بھی وہاں گئی ہوگی؟"

اس نے ایک مرتبہ پھر سر کو اثباتی جنبش دی۔

"اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ پچھلی رات کھیتوں میں ناصر کے ساتھ جو ہولناک کھیل کھیلا گیا، ریشماں اس کی چشم دید گواہ ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ قاتل کی نشان دہی کر سکتی ہے؟"

"جی ہاں، میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔" جمیل نے معتدل لہجے میں کہا۔ "اگر ناصر کو ریشماں کی آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے تو اس کا بیان آپ کو قاتل تک پہنچنے میں مدد دے سکتا ہے لیکن......"

وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے پوچھا۔ "لیکن کیا؟"

’’لیکن آپ ریشماں کا بیان لیں گے کیسے؟‘‘

’’ظاہر ہے، اس کے گھر جا کر...... اور کیسے؟‘‘ میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

’’یہ ٹھیک نہیں ہوگا تھانے دار صاحب!‘‘ وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

’’کیا ٹھیک نہیں ہوگا؟‘‘ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ’’جو بھی کہنا چاہتے ہو، کھل کر واضح الفاظ میں کہو جمیل۔‘‘

’’جناب! آپ کی تفتیش کا دائرہ اس کے گھر تک پہنچے گا تو ان کی محبت کی کہانی بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ سکے گی۔‘‘ وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ’’میں نہیں چاہتا، یہ معاملہ کھل کر گاؤں والوں کے سامنے آئے۔ ناصر تو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا، خوامخواہ ریشماں کی جگ ہنسائی ہوگی۔‘‘

’’ریشماں کی جگ ہنسائی کی اہمیت کا تو تمہیں بہت احساس ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’دوست کے قاتل کی گرفتاری کا دھیان نہیں؟‘‘

’’مجھے دونوں معاملات کا ایک جتنا خیال ہے جناب۔‘‘ وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ ’’اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔‘‘

’’میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ریشماں سے پوچھ گچھ کیے بغیر تفتیش کی گاڑی آگے کیسے بڑھے گی؟‘‘

’’میں آپ کو تفتیش سے تو نہیں روک رہا۔‘‘

’’پھر......؟‘‘ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

’’آپ ریشماں سے ضرور پوچھ گچھ کریں لیکن اس کے گھر جا کر نہیں۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ’’اس طرح تو اس بے چاری کی بڑی بدنامی ہوگی۔‘‘

’’اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔‘‘ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

’’ہے چارہ...... اگر آپ راضی ہو جائیں تو......‘‘

’’کیا کہنا چاہتے ہو جمیل؟‘‘ میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

’’اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس سلسلے میں ریشماں سے بات کرتا ہوں۔‘‘ وہ اپنی منصوبہ بندی سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’وہ پچھلی رات والے واقعے کے بارے میں جو بتائے گی، وہ میں آپ کے سامنے پیش کردوں گا۔‘‘

میں نے شک بھری نظر سے اس کی جانب دیکھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ ریشماں سے پوچھ گچھ کے حوالے سے مجھے بیچ میں سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اگر وہ دانستہ ایسی حرکت کر رہا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بہ ظاہر تو مقتول سے ہمدردی جتا رہا تھا لیکن ظاہر ہے، میں اس کا دل چیر کر تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ریشماں اور مقتول کے درمیان ایک نہایت ہی اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

میں نے چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا پھر حتمی لہجے میں کہا۔ ’’یہ مناسب نہیں ہے جمیل! میری تسلی اسی وقت ہوگی جب میں خود ریشماں سے سوال جواب کرلوں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے جناب! جیسی آپ کی مرضی۔‘‘ وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ’’میں تو آپ کی سہولت کی خاطر کہہ رہا تھا۔‘‘

’’برخوردار! میں تھانے دار ہوں ذرا وکھری ٹائپ کا۔‘‘ میں نے جمیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ’’آسانی اور آرام طلبی سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اس لیے تم میری سہولت کا خیال نہ کرو۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی نوکری کا مطلب ہے، ہر وقت مشکلات سے نمٹتے رہنا...... کیا سمجھے؟‘‘

’’جی، سمجھ گیا۔‘‘ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’آپ کو جو ٹھیک لگتا ہے وہی کریں۔ میں تو ریشماں کی بدنامی اور رسوائی کی وجہ سے بھی کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے، جب پولیس تفتیش کے لیے اس کے گھر پہنچے گی تو پھر ناصر اور ریشماں کے عشق والا معاملہ چھپ نہیں سکے گا۔ پورے گاؤں کو خبر ہو جائے گی کہ ریشماں راتوں کو چھپ چھپ کر مقتول ناصر سے ملاقاتیں کیا کرتی تھی۔ یہ بات اس کی شادی کے راستے میں بہت سے کانٹے بھی بچھا سکتی ہے جناب!‘‘

ایک لحاظ سے جمیل ریشماں کے لیے ٹھیک بھی کہہ رہا تھا۔ اگر کوئی کنواری لڑکی اس انداز میں کسی لڑکے سے منسوب پائی جائے تو اس کے کردار پر انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں اور یقیناً اس کی شادی کے معاملے میں رکاوٹ بھی پیش آسکتی ہے لیکن میں اس نازک ایشو کو کوئی ایسے انداز میں ہینڈل تھوڑی کرتا کہ پورے گلاب پور میں اس کی منادی ہو جاتی۔ ہر کام کو سلیقے اور ڈھنگ سے کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔

’’تم فی الحال ریشماں کی فکر چھوڑ دو۔‘‘ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ’’میں اس کے معاملے کو خود ہی دیکھ لوں گا۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے اس کی ذات سوالیہ نشان بن کر رہ جائے۔‘‘

’’بہت بہت شکریہ جناب۔‘‘ وہ تشکر آمیز انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’بس، میں یہی چاہ رہا تھا۔‘‘

’’اب تمہیں مجھ سے بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا؟‘‘

’’کیسا وعدہ تھانے دار صاحب!‘‘ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

’’تم یہاں سے سیدھے گھر جاؤ گے۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’اور آئندہ دو روز تک تم ریشماں سے نہیں ملو گے۔‘‘

اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نمودار ہوئے، پوچھنے لگا۔ ’’اس کا کیا مطلب ہے جناب؟‘‘

’’اس کا وہی مطلب ہے جو میں نے کہا ہے۔‘‘ میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ’’تم اگلے دو دن تک ریشماں سے نہیں ملو گے...... سمجھ گئے؟‘‘

’’اور اگر وہ خود ہماری دکان پر آئی تو؟‘‘

’’تو ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تم اس سے نارمل انداز میں بات کرو گے۔ ہمارے درمیان جو بھی گفتگو ہوئی ہے اس کے بارے میں تم ریشماں کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔‘‘ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ’’میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔‘‘

مزید چند نصیحتوں کے بعد میں نے اسے رخصت کردیا۔ وہ جیسے ہی تھانے سے نکلا، میں نے اس کی خبر گیری کے لیے ایک سادہ لباس کانسٹیبل کو اس کی کڑی نگرانی کے لیے روانہ کردیا۔ میں نے کانسٹیبل کو سمجھا دیا تھا کہ اسے خود کو پوشیدہ رکھ کر کس طرح کام کرنا ہے۔

بہ ظاہر جمیل کی نیت میں کوئی فتور نظر نہیں آتا تھا لیکن وہی بات کہ نیت کا حال صرف خدا کو معلوم ہے۔ اگر جمیل کسی بھی حوالے سے ناصر کے قتل میں ملوث ہوتا یا اس واقعے کے حوالے سے اس کے پاس کوئی ایسی معلومات ہوتیں جو اس نے مجھ سے چھپانے کی کوشش کی تھی تو شام سے پہلے اس کی چوری پکڑی جاتی تھی۔ اگر اس کے دل و دماغ میں کوئی گڑبڑ تھی تو وہ ریشماں سے ملاقات کی ضرور کوشش کرتا۔

بہر حال، جو بھی تھا وہ بہت جلد سامنے آنے والا تھا۔

میں نے آج ہی ریشماں کے گھر جا کر اس سے پوچھ گچھ کا فیصلہ کرلیا تھا اور وہ اس طرح کہ گاؤں والوں کو میرے حوالے سے کوئی ایسا شک نہ ہو کہ میں خاص طور پر ریشماں کو ٹارگٹ کر کے وہاں پہنچا ہوں۔

واقعی کسی سیانے نے بہت ٹھیک کہا ہے...... نیت صاف، منزل آسان! میری نیت صاف تھی اس لیے قدرت نے شام سے پہلے ہی میرے گلاب پور جانے کا بڑا مناسب بندوبست کردیا۔ سہ پہر میں اسپتال سے ناصر کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش آگئی تھی۔ میں نے ناصر کے وارثوں کو تھانے بلانے کے بجائے لاش کو خود گلاب پور پہنچانے کا ارادہ کیا اور جب میں تھانے سے نکل ہی رہا تھا کہ حنیفاں بھی وہاں پہنچ گئی۔ میں اسے فوراً اپنے کمرے میں لے گیا اور پوچھا۔

’’کیا رپورٹ ہے حنیفاں؟‘‘

’’وہ جو میں نے اڑتی اڑتی بتائی تھی، وہ بات سو فیصد سچ ہے ملک صاحب!‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ’’ریشماں اور ناصر کے درمیان عشق پیچا چل رہا تھا۔‘‘

’’ٹھیک ہے، تم نے تصدیق کردی ہے تو میں بھی مطمئن ہو گیا ہوں۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

’’میرے لائق اور کوئی خدمت؟‘‘

’’فی الحال نہیں......‘‘

’’میں پھر کب حاضری دوں ملک صاحب؟‘‘ وہ امید بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

’’تین چار دن کے بعد چکر لگانا۔‘‘ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ’’اسپتال سے ناصر کی لاش آگئی ہے۔ اب میں بہت مصروف ہو جاؤں گا۔‘‘

’’میرا انعام تو یاد ہے نا ملک صاحب؟‘‘

’’اور میں تمہیں تین چار دن کے بعد کس لیے بلا رہا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’انعام کی تم فکر نہ کرو۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے تم سے کام لیا ہو اور انعام نہ دیا ہو؟‘‘

’’نہیں ملک صاحب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔‘‘ وہ جلدی سے معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ’’میں تو بس آپ کو یاد دلا رہی تھی۔‘‘

تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھے سلام کر کے واپس چلی گئی۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق مقتول ناصر کی موت پچیس مئی کی رات کو ہوئی تھی۔ موت کا وقت رات گیارہ سے ایک بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ اس کے جسم پر متعدد زخم پائے گئے تھے جو تیز دھار آلات کے ذریعے لگائے گئے تھے۔ زخموں کے تفصیلی معائنے سے یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ حملہ آور دو سے زیادہ تھے اور انہوں نے خنجروں اور تیز دھار چھریوں کی مدد سے مقتول کو لہولہان کردیا تھا۔ سب سے زیادہ کاری وار اس کے پیٹ اور سینے پر کیے گئے تھے۔ سینے کے خطرناک زخموں ہی نے

ناصر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

میرا یہ اندازہ سو فیصد درست نکلا تھا کہ ناصر کو موت کے گھاٹ اتارنے والے حملہ آور ایک سے زیادہ افراد تھے جو ناصر کے لیے اپنے دل و دماغ میں شدید ترین نفرت رکھتے تھے اور یہ بات بھی طے تھی کہ قاتل ریشماں اور ناصر کی شبینہ مصروفیات سے بھی بہ خوبی آگاہ تھے۔ گویا یہ سیدھا سیدھا ''زن زر زمین'' کے مثلث کا ایک زاویہ یعنی ''زن'' تھا۔ صحیح صورت کیا تھی، اس راز سے تو ریشماں ہی پردہ اٹھا سکتی تھی۔

میں اس وقت ریشماں کے گھر ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔

جب میں ناصر کی لاش اس کے ورثا کے حوالے کرنے گلاب پور پہنچا تھا تو بشیر لوہار کے گھر کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ بعض عمر رسیدہ افراد مجھ سے یہ جاننے کی کوشش میں بھی تھے کہ ناصر کے قاتل کا کچھ پتا چلا یا نہیں۔ میں نے سب کو موقع محل کی مناسبت سے تسلی بخش جواب دے دیا تھا۔ اسی جمگھٹے میں ریشماں کا باپ شکور ترکھان بھی موجود تھا۔

میں شکور ترکھان کو چپکے سے ایک طرف لے گیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''شکور! میں قتل کی اس واردات کے سلسلے میں تم سے بھی تھوڑی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھ سے؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ جیسے توقع نہ ہو کہ میں اس سے بھی کچھ پوچھ سکتا ہوں۔

''شکور! تم بھی چاہتے ہو گے کہ میں جلد از جلد ناصر کے قاتل کو گرفتار کر کے عبرت ناک سزا دلواؤں؟'' میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔

''جی تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس گاؤں کا بچہ بچہ یہی چاہتا ہے۔ ناصر تو گلاب پور کی عزت و آبرو تھا۔''

میں نے دل میں کہا، تمہیں کیا پتا کہ گلاب پور کی عزت و آبرو تمہاری عزت و آبرو کے ساتھ کون سا کھیل، کھیل رہا تھا۔ پھر زبان سے کہا۔

''بس تو پھر تمہیں میرے سوالات کے جواب دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ میں تو فرداً فرداً سبھی سے پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ یہ میری ڈیوٹی اور تفتیش کا حصہ ہے شکور!''

شکور ترکھان کی باتوں سے مجھے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی اور مقتول کے باہمی تعلقات سے آشنا نہیں تھا۔ ان دونوں نے محبت کی پینگیں اس احتیاط کے ساتھ بڑھا رکھی تھیں کہ ہما شما تو کیا، خواص کو بھی اس کی کانوں کان خبر نہیں تھی۔ ورنہ کہیں سے تو آواز نکلتی۔

میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے کے بعد کہا۔ ''شکور! یہاں کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں ہو گا۔ کیوں نہ تمہارے گھر میں آرام سے بیٹھ کر اس موضوع پر گفتگو کریں؟''

''ٹھیک ہے جناب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ آئیں میرے ساتھ......''

میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا اور اس وقت اسی کے گھر کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔ شکور ترکھان کی دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹی ریشم عرف ریشماں اور اس کا چھوٹا بھائی شاہد جو ابھی بارہ سال کا تھا اور اس وقت گھر سے باہر اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں شکور کی بیوی سردار بی بی بھی چائے کی ٹرے اٹھائے بیٹھک میں آ گئی اور وہیں میرے سامنے جم کر بیٹھ گئی۔ شکور ترکھان نے بڑے احترام سے کہا۔

''تھانے دار صاحب! آپ چائے لیں اور مجھ سے سوال بھی کرتے جائیں۔ سردار بی بی بھی ادھر ہی بیٹھی ہے۔ اس سے بھی جو پوچھنا ہو، پوچھ لیں......''

''آپ کی بیٹی ریشماں کہاں ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

سردار بی بی نے بتایا۔ ''وہ گھر میں ہی ہے جناب۔ کل سے اسے بخار چڑھا ہوا ہے۔ حکیم جی سے دوا بھی لا کر دی ہے لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ بخار تھوڑی دیر کے لیے کم ہوتا ہے پھر پھونک کر چڑھ جاتا ہے۔''

''ریشماں کا بخار حکیم کی دوا سے ٹھیک نہیں ہو گا سردار بی بی!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟'' شکور نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں شکور......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ریشماں کو عشق کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ ناصر کی المناک موت نے اس کے دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔''

میرے اس انکشاف پر دونوں میاں بیوی نے الجھن زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بہ یک زبان ہو کر بولے۔ ''ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے رسانیت بھرے انداز میں کہا۔ ''میری باتوں کو غور سے اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سننا۔ میں آپ لوگوں کو کوئی فرضی کہانی نہیں سنانے لگا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ میں پوری تحقیق کے بعد ہی ذمے داری کے ساتھ یہ سب آپ کو بتا رہا ہوں۔''

وہ حیرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ آنکھیں پھاڑے مجھے تکنے لگے۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع اور موثر الفاظ میں انہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا اور آخر میں شکور ترکھان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں دراصل تم سے نہیں بلکہ تمہاری بیٹی سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ مجھے امید ہے، ریشماں ناصر کے قاتل تک میری راہنمائی کر سکتی ہے۔''

''مجھے تو بالکل بھی یقین نہیں آ رہا۔'' سردار بی بی پریشانی کے عالم میں بولی۔

شکور میری بات سن کر کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا تھا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''پریشان یا فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ اسی گھر کی چار دیواری کے اندر رہے گا۔ ریشماں میری بیٹی کی طرح ہے۔ میں جانتا ہوں، اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ناصر کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ آپ اسے یہاں بلائیں یا مجھے اس کے پاس لے جائیں۔ میں آپ لوگوں کے سامنے اس سے چند سوالات کروں گا اور خاموشی سے واپس چلا جاؤں گا۔''

میں اگر چاہتا تو زبردستی بھی اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا۔ میں اس علاقے کا تھانے دار تھا۔ کسی میں میرے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں تھی لیکن میں تھانے دار ہونے کے ساتھ ہی ایک عزت دار انسان بھی تھا اور دوسروں کی عزت کا بھی احساس تھا میرے دل میں۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ ناصر اور ریشماں والے معاملے سے اس کے ماں باپ واقف نہیں تھے اور میری زبانی یہ احوال سننے کے بعد وہ دونوں گویا زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ میں وہاں انہیں ذلیل کرنے نہیں آیا تھا لہٰذا مجھے ایسا کوئی کام نہیں کرنا تھا جس سے ان کی عزت کا جنازہ نکل جائے۔

بادل ناخواستہ مجھے گھر کے اندرونی حصے میں ریشماں کے پاس پہنچا دیا گیا۔ ہمارے درمیان یہ طے ہو گیا تھا کہ پوچھ گچھ کے دوران میں وہ لوگ ریشماں کے قریب نہیں بیٹھیں گے بلکہ دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سنتے رہیں گے۔ یہ احتیاط اس لیے برتی گئی تھی کہ بعد ازاں ریشماں کو اپنے والدین کی نگاہوں کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی کا احساس نہ ہو۔ میں نے شکور ترکھان اور اس کی بیوی کو اس بات کا پابند بنا دیا تھا کہ وہ میرے جانے کے بعد ریشماں سے کسی نوعیت کی باز پرس نہیں کریں گے بلکہ اس قصے کو بھول ہی جائیں گے۔ اسی میں ان کی بھلائی تھی۔ وہ اس بات کے لیے تہِ دل سے میرے شکر گزار تھے کہ میں نے انہیں اعتماد میں لے کر ان کا مان رکھ لیا تھا۔

جب وہ مجھے ریشماں کے پاس پہنچا کر واپس چلے گئے تو میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''ریشماں! میں ایک خاص مقصد سے تمہارے پاس آیا ہوں۔''

اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ وہ بیس، اکیس سال کی ایک دلکش و خوب صورت لڑکی تھی لیکن اس وقت بخار نے اس کا حال بے حال کر رکھا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہارے ماں باپ کو کچھ نہیں بتایا لیکن سچ یہ ہے کہ میں تم سے ناصر کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔''

ناصر کے ذکر پر وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی کنول کٹورا آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے اس کی سہولت کی غرض سے کہا۔ ''چونکنے اور پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ میں تمہارے اور ناصر کے معاملے سے پوری طرح واقف ہو چکا ہوں۔ جمیل نے مجھے سب کچھ کھول کر بتا دیا ہے۔ میں جلد از جلد ناصر کے قاتل کو گرفتار کر کے کڑی سزا دلوانا چاہتا ہوں اور قاتل تک تم مجھے پہنچا سکتی ہو۔''

''میں...... وہ کیسے جی؟'' وہ قدرے سنبھلے ہوئے انداز میں بولی۔

یہ جان کر کہ میں اس کی لو اسٹوری سے واقف ہو چکا ہوں، اس نے مزاحمت کے سارے ہتھیار پھینک دیے تھے اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ وہ میری توقع سے زیادہ تعاون پر آمادہ نظر آتی تھی۔

''وقوعہ کی رات تم ناصر سے ملنے کھیتوں میں گئی تھیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ ناصر پر کن لوگوں نے حملہ کیا تھا؟''

''میں اس رات ناصر سے ملنے نہیں گئی تھی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

اس کی آواز میں شامل اعتماد نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی تھی لیکن تصدیق پھر بھی ضروری تھی۔ میں نے کہا۔

''جمیل نے مجھے بتایا ہے کہ اس رات تم دونوں کی ملاقات کا پکا پروگرام تھا۔ یہ بات اس سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ ناصر وہاں پہنچا تھا؟''

"یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ ناصر وہاں کیوں گیا تھا۔" وہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ "جبکہ اس نے خود ہی پروگرام کینسل کیا تھا۔"

"پروگرام کینسل کیا تھا؟" میں چونک اٹھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں تھانے دار صاحب۔" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ "مجھے کچھ پتا نہیں، ناصر پروگرام کینسل کرنے کے بعد خود وہاں کیوں گیا تھا۔ کل سے یہی سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹا جارہا ہے۔"

"ایک منٹ......" ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کررہا تھا۔ "تم دونوں کے بیچ رابطے کا ذریعہ جمیل ہی تھا نا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"لیکن جمیل تو پچھلے دو دن سے گلاب پور میں موجود ہی نہیں تھا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "پھر پروگرام کو کینسل کرنے والی بات تمہیں کس نے بتائی تھی؟"

"امتیاز نے......!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کون امتیاز؟" میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

"امتیاز چاچا مقبول کا لڑکا ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا امتیاز کو بھی تم دونوں کے چکر کی خبر تھی؟"

"نہیں جی...... وہ تو بے چارہ بچہ ہے۔" ریشماں نے بتایا۔ "امتیاز کی عمر آٹھ نو سال ہوگی۔ ادھر ہمارے پڑوس ہی میں رہتا ہے۔"

"اوہ......" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ "امتیاز نے تم سے کیا کہا تھا؟"

"جس رات ہماری ملاقات طے تھی، اسی شام امتیاز نے مجھے دیکھ کر کہا تھا کہ ناصر بھائی نے کہا ہے، آج نہیں آنا......"

"تم نے امتیاز سے کوئی سوال نہیں کیا تھا؟"

"کیا تھا جی......" وہ بولی۔ "مجھے تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ ناصر نے امتیاز کے ہاتھ کیوں پیغام بھجوایا تھا۔ میں نے امتیاز کو چیک کرنے کے لیے پوچھا تھا کہ کہاں نہیں جانا مجھے؟"

"پھر اس نے کیا جواب دیا؟" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"اس نے جواب دیا کہ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔" ریشماں نے بتایا۔ "ناصر بھائی نے بس اتنا کہا تھا کہ ریشماں کو چپکے سے بتادو، آج نہیں آنا۔ اسے کوئی ضروری کام ہے......" وہ لمحے بھر کے لیے رکی، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"جمیل تو یہ ٹیک سنگھ گیا ہوا تھا ورنہ میں اس کی دکان پر جاکر تصدیق کرلیتی۔ امتیاز کو مزید کچھ معلوم نہیں تھا اور ناصر سے جاکر میں پوچھ نہیں سکتی تھی۔ بس، میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آج رات ناصر سے ملنے نہیں جاؤں گی۔"

"اوہ!" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے، ناصر کو پوری منصوبہ بندی سے قتل کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے، امتیاز اس شخص کو ضرور جانتا ہوگا جس نے ناصر کے حوالے سے اسے تمہارے لیے پیغام دیا تھا۔"

"آپ امتیاز سے پوچھیں جی۔" وہ نرمی سے بولی۔ "میری تو حالت بہت خراب ہورہی ہے۔ بار بار چکر آرہے ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں نا...... بخار بھی کتنا تیز چڑھا ہوا ہے۔"

"تم آرام کرو ریشماں!" میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "سارے معاملات اب میں خود سنبھال لوں گا۔ تم نے جتنا تعاون کردیا ہے، وہی میرے لیے کافی ہے۔"

میں دوبارہ بیٹھک میں پہنچا تو میاں بیوی نے مجھے گھیر لیا۔ شکور ترکھان نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"تھانے دار صاحب! کچھ پتا چلا؟"

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "کچھ نہیں بلکہ سب کچھ پتا چل گیا ہے۔"

"ہمیں بھی تو بتائیں۔" سردار بی بی نے کہا۔

"آپ اپنے پڑوسی کے بچے امتیاز کو یہاں بلائیں۔"

"وہ ابھی تو شاہد کے ساتھ گلی میں کھیل رہا تھا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں ابھی بلاتی ہوں اسے......" یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھک سے باہر نکل گئی۔

شکور ترکھان نے فکرمندی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پر کچھ پتا تو چلے۔"

"ابھی پتا چل جائے گا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "امتیاز کو آجانے دیں۔"

اگلے ہی لمحے سردار بی بی امتیاز کو لے کر بیٹھک میں آگئی۔ امتیاز کی عمر لگ بھگ آٹھ سال رہی ہوگی۔ وہ ایک معصوم اور بھولا بھالا بچہ تھا۔ میں نے پیار سے اسے اپنے پاس بلایا اور سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد پوچھا۔

"بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "امتیاز!"

"جانتے ہو، میں کون ہوں؟"

"آپ پولیس ہو۔" وہ بڑے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

امتیاز خاصا سمجھ دار بچہ ثابت ہورہا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں سوال و جواب کا سلسلہ جاری رکھا۔ "تمہیں پتا ہے، پولیس کیا کرتی ہے؟"

"پولیس سب لوگوں کو پکڑ کر تھانے میں بند کردیتی ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"سب لوگوں کو نہیں۔" میں نے کہا۔ "صرف ان کو جو گندے ہوتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا، گندے لوگ کون ہوتے ہیں؟"

"جو جھوٹ بولتے ہیں وہ گندے بچے ہوتے ہیں۔" وہ معصومیت سے بولا۔ "اور جو گالیاں دیتے ہیں وہ بھی گندے بچے ہوتے ہیں۔"

"شاباش!" میں نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے پوچھا۔ "امتیاز بیٹا...... صحیح صحیح بتاؤ، تم گندے بچے ہو یا اچھے بچے؟"

"میں اچھا بچہ ہوں جی۔" وہ بڑے فخر سے بولا۔ "میں کسی کو بھی گالیاں نہیں دیتا۔"

"اور تم جھوٹ بھی نہیں بولتے...... ہیں نا؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"پرسوں شام کو تم نے ریشماں باجی سے کہا تھا نا کہ ناصر بھائی نے کہا ہے، آج نہیں آنا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایسا ہوا تھا نا؟"

"جی ہوا تھا۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"تم بہت اچھے بچے ہو امتیاز۔" میں نے سراہنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں تمہیں بہت ٹافیاں دوں گا۔ اب یہ بھی بتادو کہ تم نے ریشماں باجی کو کہاں جانے سے منع کیا تھا؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا جی......" وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ "آپ کو یقین نہیں آرہا تو میں رب کی قسم کھاتا ہوں۔"

"نہیں بیٹا، قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تم پر بھروسا ہے۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "تم نے تو ریشماں باجی سے وہی کہا جو ناصر بھائی نے تم سے کہا تھا...... ہیں نا؟"

"نہیں جی۔" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا نہیں؟"

"یہ بات مجھ سے ناصر بھائی نے نہیں کہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر کس نے کہی تھی؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"حیدر بھائی نے......!"

"تمہارا مطلب ہے حیدر علی۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "زلیخاں بی بی کے بیٹے حیدر علی نے؟"

"جی جی...... وہی حیدر بھائی۔" وہ جلدی سے بولا۔

☆☆☆

حیدر علی کا گھر بھی گلاب پور ہی میں واقع تھا لہٰذا وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ حیدر علی، سردار بی بی کی بڑی بہن زلیخاں بی بی کا بیٹا یعنی ریشماں کا کزن تھا۔ میری معلومات کے مطابق سردار بی بی اپنی بیٹی کا رشتہ حیدر علی سے کرنے کی خواہش رکھتی تھی اور یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ حیدر علی کا دعویٰ ہے کہ ریشماں اس کی بچپن کی مانگ (منگیتر) ہے۔ اس تناظر میں یہ سمجھنا کوئی راکٹ سائنس نہیں تھا کہ جب حیدر علی کو ریشماں اور ناصر کے تعلقات کا پتا چلا ہوگا تو اس نے اپنے رقیب کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہوگی۔

ان حالات میں نظر یہی آرہا تھا کہ یہ کیس حل چکا۔ حیدر علی میرے ہتھے چڑھے گا اور میں ذرا دھمکا کر یا تھوڑی بہت تفتیش کے بعد اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہوجاؤں گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔

جب میں زلیخاں کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ حیدر علی وہاں موجود نہیں ہے۔ زلیخاں بی بی نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ گھر ہی میں تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا۔ "گھر میں تھا تو اب کہاں ہے؟"

کون سے نبی کہاں دفن ہیں

حضرت آدم علیہ السلام...... سری لنکا
حضرت نوح علیہ السلام...... اردن
حضرت ہود علیہ السلام...... لبنان
حضرت لوط علیہ السلام...... عراق
حضرت ابراہیم علیہ السلام...... اسرائیل
حضرت اسحاق علیہ السلام...... فلسطین
حضرت یعقوب علیہ السلام...... فلسطین
حضرت یوسف علیہ السلام...... فلسطین
حضرت ایوب علیہ السلام...... عمان
حضرت اسماعیل علیہ السلام...... سعودی عرب

مرسلہ: محمد خواجہ، کورنگی کراچی

''پتا نہیں جی......'' وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''مجھے تو کچھ بتایا نہیں......'' ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا۔ ''پر بات کیا ہے جی......آپ حیدر کو کیوں ڈھونڈ رہے ہیں؟''

اس کی تشویش بجا تھی۔ پولیس کسی دروازے تک چلی آئے اور اس گھر کے کسی مکین کے بارے میں پوچھ گچھ کرے تو اہلِ خانہ کا فکرمند ہو جانا عین فطری بات ہے۔

میں زلیخاں کو... اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا لہٰذا انتہائی ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں یہ تو پتا ہے نا، گلاب پور کا ایک گبرو جوان قتل ہو گیا ہے؟'' بات ختم کر کے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''جج......جی!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''بشیر لوہار کے جوان جہان بیٹے ناصر کو کسی ظالم نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔''

''کسی نے نہیں...... ایک خاص بندے نے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''خاص بندے نے...... کون خاص بندہ؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

''جس کی تلاش مجھے تمہارے گھر تک لے آئی ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تمہارا لاڈلا بیٹا، حیدر علی۔''

''اوہ......'' وہ ایک سراسیمہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا بیٹا کسی کو قتل نہیں کر سکتا......آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''ہر ماں باپ کا یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کا بیٹا بہت معصوم ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ گھر سے سیدھا مسجد جاتا ہے اور مسجد سے گھر لیکن جب پولیس کسی ایسے جلیبی کی طرح سیدھے بندے کو تفتیش کی چکی میں ڈالتی ہے تو پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ایک دم الگ ہو جاتا ہے۔ میں پکے ثبوت کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔''

''کون سا ثبوت؟'' وہ کمزور سی آواز میں بولی۔

''ثبوت حیدر کی زبان ہی سے تمہیں سناؤں گا۔'' میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔ ''ذرا وہ میرے ہاتھ تو لگ جائے۔''

''پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ مریلی سی آواز میں بولی۔ ''میرے تو کچھ بھی پلے نہیں پڑ رہا......''

میں دانستہ کھل کر ریشماں اور امتیاز کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ریشماں کی محبت گلاب پور کی گلی گلی کا فسانہ بن کر رہ جائے۔ ہاں، جب حیدر علی میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر اس سے کھل کر اس موضوع پر بات ہو سکتی تھی۔

میں نے حیدر علی کو اس کے گھر سے غائب پا کر پورے گلاب پور میں تلاش کرایا مگر وہ کہیں سے بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ گاؤں سے باہر جا چکا ہے۔ گاؤں کا کوئی فرد حیدر علی کے بارے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔

اس صورتِ حال میں ایک خیال بڑی سرعت سے میرے دماغ سے گزرا اور وہ یہ کہ...... کہیں گاؤں میں پولیس کی آمد نے اسے چوکنا تو نہیں کر دیا اور وہ خود ہی کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہو۔

حیدر علی کی یہ پراسرار گمشدگی بھی اس امر کی جانب اشارہ کرتی تھی کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں کافی دیر سے گلاب پور میں موجود تھا۔ میں نے مقتول ناصر کی لاش کو اس کے ورثا کے حوالے کرنے کے بعد شکور ترکھان کے گھر کا رخ کیا تھا جہاں شکور کے علاوہ اس کی بیٹی ریشماں سے بھی میری تفصیلی بات ہوئی تھی جو کہ اب اس کیس کا ایک اہم کردار بن چکی تھی۔ ممکن ہے، حیدر علی نے مجھے شکور کے گھر جاتے دیکھ لیا ہو اور دل کے چور نے اس کے کان کھڑے کر دیے ہوں لہٰذا وہ منظر سے غائب ہو گیا ہو...... حیدر علی کا فوری طور پر دستیاب ہونا بہت ضروری تھا جو عملاً مجھے ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے زلیخاں کو ہدایت کی کہ اس کا بیٹا حیدر علی جیسے ہی گھر آئے، وہ اسے میرے پاس تھانے بھیج دے۔ اس نے میرے احکام کی تعمیل کا یقین دلایا اور میں گلاب پور سے نکل کر اپنے تھانے آ گیا۔

تھانے آ کر میں نے ایک اہم کام یہ کیا کہ ایک سادہ لباس پولیس اہلکار کو حیدر علی کی تلاش پر مامور کر دیا۔ اسے گلاب پور میں رہتے ہوئے گاؤں کے اندرونی حالات پر نظر رکھنا تھی اور یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ اگر حیدر علی واقعی گاؤں سے باہر گیا ہے تو وہ کہاں جا سکتا ہے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ گاؤں ہی میں کہیں چھپا بیٹھا ہو۔

☆☆☆

آئندہ روز میں فجر کی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کوارٹر کا صحن عبور کرنے کے بعد داخلی دروازہ کھولا تو سامنے کانسٹیبل نیاز کھڑا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

''ملک صاحب! اتنی صبح تکلیف دینے کے لیے معذرت چاہتا ہوں مگر بات ہی ایسی ہے کہ......''

''تکلیف اور معذرت کی باتیں چھوڑو۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''میں خود کو چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر تصور کرتا ہوں۔ تم بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟''

''گلاب پور سے ایک اہم اطلاع آئی ہے۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ نے جس کانسٹیبل کو سادہ لباس میں وہاں حیدر علی کی نگرانی پر مامور کر رکھا ہے، اس نے ایک بندے کے ذریعے یہ اطلاع دی ہے کہ حیدر علی رات کے آخری پہر واپس آیا تھا اور اس وقت اپنے گھر میں سو رہا ہے۔''

یہ واقعی انکشاف انگیز اور اہم اطلاع تھی۔ میں نے کانسٹیبل نیاز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''نیاز! حوالدار بخش علی سے کہو کہ ابھی اور اسی وقت اطلاع کنندہ کے ساتھ گلاب پور روانہ ہو جائے اور پہلی فرصت میں حیدر علی کو گرفتار کر کے تھانے لے آئے۔''

''جی...... جو حکم ملک صاحب۔'' اس نے مؤدبانہ انداز میں گردن جھکا کر کہا اور تھانے کے اندرونی حصے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

میں نے کوارٹر کا داخلی دروازہ بند کیا اور حیدر علی کے بارے میں سوچتے ہوئے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ ابھی تک حالات و واقعات کی جو کڑیاں میرے ہاتھ لگی تھیں ان سے بننے والی زنجیر حیدر علی کو مجرم کی شکل میں پیش کرتی تھی۔ وہ ریشماں کو اپنی ''منگ'' یعنی منگیتر گردانتا تھا۔ امتیاز والے واقعے سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ حیدر علی کو ریشماں اور مقتول ناصر کے تعلقات کا علم تھا لہٰذا اس امر کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ حیدر علی نے اپنی راہ کا کانٹا ہٹانے کی کوشش کی ہوگی۔

ناشتے کے بعد جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو سورج کافی اوپر تک اٹھ چکا تھا۔ آج گزشتہ چند روز کی بہ نسبت گرمی کی شدت میں کچھ کمی محسوس ہو رہی تھی مگر اسے سہانا موسم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ گرمی کم ہو یا زیادہ اس کا اپنا ایک تکلیف دہ مزاج ہوتا ہے۔

کچھ ہی دیر کے بعد حوالدار بخش علی مطلوبہ شخص حیدر علی کو گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ حیدر علی کی نگرانی پر مامور سادہ لباس پولیس اہلکار تو ان کے ہمراہ تھا ہی۔ اس کے علاوہ بھی ایک شخصیت ان کے ساتھ تھی اور وہ تھی حیدر علی کی ماں زلیخاں بی بی......سردار بی بی کی بڑی بہن!

زلیخاں اپنے بیٹے کی گرفتاری پر اچھا خاصا واویلا مچا رہی تھی جس کی وجہ سے تھانے کا ماحول کسی مچھلی بازار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ حیدر علی اصل مجرم تھا یا نہیں اس بات کا حتمی فیصلہ تو تفتیش کے بعد ہی کیا جا سکتا تھا لہٰذا موقع محل کے مطابق ایک ماں کے جذبات کی قدر اور احترام بھی واجب تھا۔

''زلیخاں بی بی! شور کیوں مچا رہی ہو؟'' میں نے برہمی سے کہا۔

''ہائے ہائے......'' وہ عجیب سے دکھی لہجے میں بولی۔ ''آپ میرے جوان جہان بیٹے کو گرفتار کر کے لائے ہیں اور میں فریاد بھی نہ کروں؟''

''میں نے تمہارے بیٹے کو پوچھ گچھ کے لیے تھانے بلوایا ہے، پھانسی لگانے کے لیے نہیں۔'' میں نے ڈانٹنے والے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''میرا حیدر قاتل نہیں ہو سکتا۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ''آپ خوامخواہ اس بے چارے پر شک کر رہے ہیں۔''

''میں کچھ بھی خوامخواہ نہیں کرتا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارا بیٹا بے قصور ہے تو میں اس بات کی تمہیں گارنٹی دیتا ہوں کہ اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ میں حیدر علی کا دشمن نہیں ہوں مگر میں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔ قانون کے تقاضے پورے کرنا ضروری ہیں۔''

مجھے اندازہ نہیں کہ میری بات کس حد تک اس کی سمجھ میں آئی تھی تاہم میری تسلی نے کسی حد تک اسے مطمئن کر دیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اللہ کرے گا، میرا بیٹا بے گناہ ثابت ہوگا۔''

''میرا مشورہ ہے کہ تم واپس گلاب پور چلی جاؤ۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر حیدر علی بے قصور ہوا تو آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے یہ صحیح سلامت اپنے گھر پر، تمہاری نظر کے سامنے موجود ہوگا۔''

اس کا تھانے سے جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا تاہم میرے سمجھانے بجھانے پر وہ گھر جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ میں نے حیدر علی کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ حوالدار بخش علی بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ حیدر علی میرے سامنے کھڑا ہو گیا تو میں کچھ لمحے کے لیے... گہری نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''حیدر! اس کمرے میں تمہاری زبان کھل جائے گی یا تمہیں ڈرائنگ روم کی سیر کرانا پڑے گی؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ میرے سوال پر وہ اندر سے

ڈھل کر رہ گیا تھا تاہم خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''جی، میں نے کیا...... کیا ہے......؟''

''کیا کیا ہے...... کے تخم!'' میں نے دہاڑ کر کہا۔ ''یہ بھی میں بتاؤں کہ تمہارے کالے کرتوت کیا کیا ہیں...... ہیں؟''

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''تم نے ناصر کو قتل کیا ہے۔''

''نن...... نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔''

''پھر ناصر کا قاتل کون ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''مم...... مجھے...... کچھ پتا نہیں...... تھانے دار صاحب......''

''تمہیں یہ تو پتا ہے ناکہ...... ریشماں تمہاری بچپن کی مانگ ہے......'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

''جی...... جی ہاں!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''اور یہ بھی تمہارے...... علم میں تھا کہ مقتول ناصر اور تمہاری مانگ ریشماں میں پچھلے کچھ عرصے عشق پیچا چل رہا تھا...... ہیں نا؟''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم اچھی طرح سمجھ چکے ہو۔'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''سیدھی طرح حقیقت کا اعتراف کرتے ہو یا میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کروں؟''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں جناب۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ناصر کو قتل نہیں کیا۔''

''ناصر کے قتل والی بات پہلے ہو چکی......'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''ابھی میرے اس سوال کا جواب دو کہ تمہیں ریشماں اور ناصر کے باہمی تعلقات کا علم تھا یا نہیں...... ہاں یا نہ......؟''

''نن...... نہ......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ہوں!'' میں نے تیز نظر سے گھورتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ ''تم تو امتیاز کو بھی نہیں جانتے ہو گے؟''

''کون امتیاز!'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

''مقبول چاچا کا بیٹا امتیاز......'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''جس کی عمر آٹھ نو سال ہو گی اور جو ریشماں کے بھائی شاہد کا دوست اور ان کا پڑوسی بھی ہے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''کچھ یاد آیا یا تمہارے سر میں چھترول کرنا پڑے گی؟''

''اچھا...... آپ اس بچے کی بات کر رہے ہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''ہاں وہی بچہ جس کے ہاتھ تم نے ریشماں کے لیے یہ پیغام بھجوایا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کہ ناصر بھائی نے کہا ہے، آج نہیں آنا۔''

''مم...... میں نے...... تو اس سے...... ایسی کوئی بات...... نہیں کہی تھی۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔

''تمہارے اس کارنامے کے دو گواہ موجود ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک امتیاز جس کے ہاتھ تم نے یہ پیغام بھجوایا تھا اور دوسری ریشماں جس کے لیے تم نے یہ پیغام بھجوایا تھا...... اب بتاؤ، کیا کہتے ہو؟''

وہ میری اس چڑھائی کے نتیجے میں بری طرح بوکھلا گیا اور اپنی جان بچانے کے لیے آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

حوالدار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! یہ کتے کا تخم آپ کی بات نہیں سمجھ رہا۔ آپ ایک گھنٹے کے لیے اسے میرے حوالے کر دیں۔ پھر دیکھیں کس طرح یہ فر فر بولنے لگے گا۔''

اور میں نے حیدر علی کو حوالدار بخش علی کے حوالے کر دیا۔

کسی بھی مجرم کی بچت اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ جاتا۔ ایک مرتبہ وہ قانون کی گرفت میں آجائے تو پھر پولیس کے پاس اس کی زبان کھلوانے کے ایک سو ایک طریقے موجود ہوتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈرائنگ روم (کمرۂ تفتیش) کی جانب سے حیدر علی کے بلبلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ آوازیں کرب ناک صداؤں میں بدل گئیں۔

ایک گھنٹے سے بھی پہلے حوالدار نے میرے کمرے میں آکر خوشخبری سنائی۔ ''ملک صاحب! مبارک ہو۔ حیدر نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔ آپ اس کا بیان لے لیں۔''

''مطلب یہ کہ اس نے ناصر کو قتل کرنے کا اقرار کر لیا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے بخش علی کی جانب دیکھا۔

''جی نہیں!'' وہ نفی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”پھر......؟“

حوالدار رازدارانہ انداز میں مجھے ان انکشافات سے آگاہ کرنے لگا جو اس کی ”کاری محنت“ کے نتیجے میں حیدر علی کی زبان سے ہوئے تھے۔

☆☆☆

حیدر علی، ناصر کے قتل میں بالواسطہ ملوث نہیں تھا۔ یہ کام اس نے بلاواسطہ کیا تھا۔ ننھے امتیاز کے توسط سے ریشماں تک یہ پیغام اسی نے بھجوایا تھا کہ...... ناصر بھائی نے کہا ہے، آج نہیں آنا۔

یہ پیغام حیدر نے دراصل چودھری آفتاب کے ایما پر دیا تھا تاکہ وقوعہ کی رات ریشماں اپنے عاشق سے ملنے مقررہ مقام پر نہ پہنچے اور ناصر کو ٹھکانے لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔

چودھری آفتاب کا تعلق نزدیکی گاؤں نذیر آباد سے تھا۔ وہ نذیر آباد کے چودھری فرید احمد کا بیٹا تھا اور کبڈی کا کھلاڑی تھی۔ حالیہ کبڈی ٹورنامنٹ کا فائنل جیسا کہ اس کہانی کی ابتدا میں بتایا جاچکا ہے، گلاب پور اور نذیر آباد کی ٹیموں کے درمیان کھیلا گیا تھا اور اس مقابلے میں نذیر آباد کو شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ فتح اور کپ گلاب پور کے حصے میں آئے تھے۔ اس مقابلے میں ایک کبڈی مقتول ناصر اور چودھری آفتاب کے بیچ بھی پڑی تھی جس میں ناصر نے چودھری آفتاب کو اس بری طرح رگیدا تھا کہ اس کی ناک اور باچھوں سے خون جاری ہوگیا تھا۔ ایک تو گاؤں کی شکست اور اس پر اپنی یہ درگت چودھری آفتاب کے جذبۂ انتقام کو ہوا دینے کے لیے کافی تھی۔ میدان جنگ (کبڈی والے کھیت) میں تو وہ ناصر کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا تھا مگر اس نے کبڈی کے اس فاتح کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کرلیا۔

چودھری آفتاب کو اس حقیقت کا علم تھا کہ حیدر علی، ریشماں کو اپنے بچپن کی مانگ کہتا ہے۔ کسی طرح چودھری آفتاب نے یہ پتا بھی چلا لیا کہ ان دنوں ناصر اور ریشماں کے بیچ عشق و محبت کے معاملات عروج پر ہیں لہٰذا اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا خطرناک منصوبہ بنالیا۔

حیدر علی کو ریشماں اور ناصر کے تعلقات کا شک تو تھا لیکن جب چودھری آفتاب نے اس کی اس جانب خصوصی توجہ دلائی تو وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ چودھری نے اسے سمجھایا کہ جذبات میں آنے کے بجائے اگر طریقے سلیقے سے کام کیا جائے تو سانپ بھی مرجاتا ہے اور لاٹھی بھی سلامت رہتی ہے۔ حیدر علی نے چودھری آفتاب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔

حیدر علی نے اپنے ہاتھوں سے ناصر کو قتل نہیں کیا تھا تاہم وہ اس سازش کا حصہ رہا تھا بلکہ جب چودھری کے بھیجے ہوئے دو بندے تیز دھار خنجروں کی مدد سے ناصر کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار رہے تھے تو حیدر علی تھوڑے فاصلے پر اندھیرے میں کھڑا یہ خونیں تماشا دیکھ رہا تھا۔

حیدر علی کے اقبالِ جرم اور گواہی پر میں نے اسی روز خود نذیر آباد جاکر چودھری آفتاب کو ناصر کے قتل کے سلسلے میں گرفتار کرلیا۔ آفتاب نذیر آباد کے چودھری فرید احمد کا بیٹا تھا لہٰذا اس گرفتاری کے سلسلے میں مجھ پر اچھا خاصا دباؤ بھی تھا تاہم میں نے چودھری فرید کے اثر رسوخ کی ذرا پروا نہ کی اور چودھری آفتاب اور اس کی نشاندہی پر ان دو بندوں کو بھی حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا جو ناصر کے قتل میں ملوث تھے۔

اپنی ہر کوشش کو ناکامیاب ہوتے دیکھ کر چودھری فرید نے دھمکی آمیز لہجے میں مجھ سے کہا تھا۔ ”ملک صاحب! آپ کو میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے کو عدالت سے چھڑالوں گا۔“

”چودھری صاحب! میں صرف خدا کی طاقت اور قانون کی بالادستی پر یقین رکھتا ہوں۔“ میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ”آپ نے جتنا زور لگانا ہے، لگالیں۔ انشاء اللہ آپ کا ہونہار لختِ جگر عدالت سے سیدھا جیل جائے گا۔“

میں نے حیدر علی، چودھری آفتاب اور ناصر کے دونوں قاتلوں کے خلاف حتی اُلامکان سخت پرچہ کاٹ کر انہیں عدالت کے حوالے کردیا۔ دونوں قاتل چونکہ اپنے جرم کا اقرار کرچکے تھے لہٰذا ان کی باقی ماندہ زندگی تو جیل کی بلند و بالا پتھریلی دیواروں کے پیچھے گزرنا تھی۔ حیدر علی اور چودھری آفتاب کو بھی شریکِ جرم اور اس خطرناک سازش کا حصہ ہونے کے جرم میں اور کہیں نہیں بلکہ سیدھا جیل ہی جانا تھا۔

جب میں ان چاروں مجرموں کو عدالت میں پیش کرنے لے جارہا تھا تو میں نے دیکھا، حیدر علی کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ یہ اشکِ ندامت تھے لیکن اب اظہارِ ندامت کا وقت گزر چکا تھا۔ وقت گزر جانے کے بعد ہر قسم کا پچھتاوا اور پشیمانی بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ریشماں کو ناصر نہ مل سکا اور حیدر علی کو ریشماں حاصل نہ ہوئی۔

(تحریر: حُسلم بٹ)